اٰتینٰہ الحکمۃ وفصل
الخطاب
ALL INDIA MUSLIM EDUCATIONAL CONFERENCE
SULTAN JAHAN MANZIL, ALIGARH
۱۹۱۴ء کی یادگار تقریر
مع
خطبہ صدارت
خان بہادر سر رحیم بخش
۲۸واں سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس راولپنڈی
پروفیسر محمد سلیمان اشرف

آتیناہ الحکمۃ وفصل الخطاب

پروفیسر محمد سلیمان اشرف

۱۹۱۴ء کی یادگار تقریر

مع

خطبہ صدارت: خان بہادر سر رحیم بخش

۲۸ واں سالانہ اجلاس آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (راولپنڈی)

ادارہ پاکستان شناسی لاہور

کتاب : الخطاب
تقریر : مولانا محمد سلیمان اشرف
خطبۂ صدارت : خان بہادر سر رحیم بخش
بار اوّل : علی گڑھ، ۱۹۱۵ء
طبع جدید : اکتوبر ۲۰۱۶ء
تقدیم و تحشیہ : ظہور الدین امرتسری
ترجمہ فارسی اشعار : ڈاکٹر معین نظامی
کمپوزنگ : محمد نعیم اصغر ۰۳۳۳-۴۴۷۴۹۵۹
ضخامت : ۱۸۸ صفحات
تعداد : گیارہ سو
مطبع : ایوب پرنٹنگ پریس، لاہور
ناشر: : ادارۂ پاکستان شناسی، ۲/۴۴ سوڈھیوال کالونی، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۰۰
فون: ۰۳۲۲-۴۰۰۵۹۵۲
ہدیہ : ۳۵۰ (تین صد پچاس روپے)

<u>ڈسٹری بیوٹرز</u>
خان بک کمپنی: ۳ کورٹ اسٹریٹ، لوئر مال، لاہور فون: ۰۴۲-۳۷۳۲۵۴۶۳
ادبستان: ۶-سی دربار مارکیٹ، لاہور فون: ۰۳۰۰-۴۱۴۰۲۰۷
بیکن بکس: گلگشت، ملتان فون: ۰۶۱-۶۵۲۰۷۹۰-۷۹۱
دارالعلوم نعیمیہ: فیڈرل بی ایریا، دستگیر بلاک نمبر ۱۵، کراچی فون: ۰۲۱-۳۶۳۳۴۲۳۶

پہلی وحی اور علم

صرف اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے علم و تعلیم پر ہر مذہب سے زیادہ زور دیا ہے۔ حتیٰ کہ قرآن مجید کی پہلی وحی کا سب سے پہلا لفظ "اِقْـــرَأْ" ہے، جس کے معنی ہیں پڑھو۔ یعنی قرآن مجید سب سے پہلے پڑھنے ہی کا حکم دیتا ہے۔ پڑھنے کے علاوہ لکھنے کو بھی بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے، چناں چہ اسی اولین وحی میں اللہ کے مقدس اوصاف کا علم عطا فرماتے ہوئے کہتا ہے:

اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ — پڑھو، اور تمہارا رب بے حد کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم عطا فرمایا ہے۔

قلم اور لکھنے کی راہ سے علم کی اشاعت اسلام کی نگاہ میں اس قدر اہم ہے کہ اس کو اللہ کا بہت بڑا عطیہ فرماتا ہے۔ اتنا بڑا عطیہ کہ اولین وحی میں تخلیق انسانی کے ذکر کے بعد اسی عطیہ کو بیان کرتا ہے۔ اب اندازہ لگاؤ اس کی اہمیت کا! یوں تو اللہ کے لامحدود عطیے ہیں لیکن قلم اور کتابت کی راہ سے علم عطا فرمانا وہ عَطیۂ خاص ہے کہ اولین وحی میں صرف تین عطائے الٰہی کا ذکر ہے جن میں ایک یہ ہے۔

ان تین عطایا کا ذکر بہ ترتیب ذیل ہے:

۱ انسان کو علق سے پیدا فرمایا۔ (خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ)

۲ قلم کے ذریعہ علم عطا فرمایا۔ (عَلَّمَ بِالْقَلَمِ)

۳ اور ذرائع سے بھی علم دیا۔ (عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ)

(جواہر البیان فی تفسیر القرآن، جلد دوم: علامہ عزیز الحق کوثر ندوی، مطبوعہ بنارس (یوپی) بھارت، ۲۰۰۹ء)

تحریک آزادی میں اسلامیان ہند
کے لیے جدید تعلیمی استعداد کی اہمیت
اور علماءِ کرام کا کردار

سب سے اوّل ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں کے دلوں پر سے اُن خیالات کا اثر دور ہو جو اُن کو جدید تعلیم میں ترقی کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ یہ کام فی الحقیقت ہماری قوم کے علما کا ہے کیوں کہ وہی مسلمانوں کو سمجھا سکتے ہیں کہ یہ عین مذہب کا منشا ہے کہ ہم علمی اور اخلاقی میدان میں ترقی کریں۔ اسلام نے علم کی ضرورت اور وقعت کو جس قدر سمجھایا ہے کسی ملّت نے ایسا نہیں کیا۔ کلام پاک میں ارشاد ہے۔ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ''(اور اے پیغمبر) دعا کرتے رہا کرو کہ اے میرے پروردگار مجھے اور زیادہ علم نصیب کرنا''۔ دولت کے لیے نہیں کی، اولاد کے لیے نہیں، ملک کے لیے نہیں، دنیاوی سروسامان کے لیے نہیں، ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا اگر کی تو زیادتی علم کے لیے۔ اب یہ ہمارے علما کا کام ہے کہ وہ یہاں کے مسلمانوں کو سمجھائیں کہ جدید تعلیم میں اعلیٰ مدارج حاصل کرنا عین دین کا منشا ہے۔

(رپورٹ متعلق اٹھائیسواں سالانہ اجلاس ۱۹۱۴ء۔ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ راولپنڈی، صفحہ ۱۲۷)

مولانا زبیری کے دیباچہ کی چند سطور

اٹھارھویں صدی کے آخر سے اُنیسویں صدی کے چوتھائی سے زیادہ عرصہ تک مسلسل چالیس بیالیس برس کی مدت میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے مسلمانانِ ہندوستان میں جس استقلال و استقامت کے ساتھ تعلیم منادی کا فرض انجام دیا ہے اور جس طرح قوم کے اندر علوم جدیدہ کی اشاعت و تبلیغ میں پانی کی طرح روپیہ بہایا ہے جو بلاشبہ یہ ایک بیش بہا قومی خدمت ہے۔ جس زمانہ میں اور جن حالات کے اندر کانفرنس قایم ہوئی اس وقت دنیا متحرک تھی اور مسلمان ساکن و جامد۔ قومی تعلیم کے لحاظ سے وہ ایک تاریک زمانہ تھا جس کے اندھیرے میں ہماری تمام حسیاتِ ملی مُردہ ہو رہی تھیں۔ اس مجلس کے میر مجلسوں نے دور حاضرہ کی ضرورت اور حقائق حالات کی بنا پر اپنے زبردست خطبوں کے ذریعہ سے قوم کو تعلیم پر متوجہ کرنے کی اہم کوشش کی۔

دیباچہ: خطباتِ عالیہ، حصہ اوّل
مسلم یونی ورسٹی پریس علی گڑھ، ۱۹۲۷ء

ایک اور اقتباس

ہر زبان کے خطیبوں کے خیالات اور افکار ذہنی و دماغی کا ذخیرہ اُس زبان کا بیش بہا سرمایہ متصور ہوتا ہے جس زبان میں کہ وہ ادا کیے جاتے ہیں۔ جو اپنے زمانہ کے لحاظ سے راہِ عمل اور مستقبل کے لیے قوم کی ہمت اور جوش کا افسانہ تاریخی صفحۂ عالم پر اُن کے کارنامۂ عمل کی زندہ یادگار بن کر چمکتا ہے۔ موجودہ نسلیں اُن کے ساتھ خواہ کچھ ہی سلوک کیوں نہ کریں، لیکن یقیناً آنے والی نسلیں اُس کو شوق سے پڑھتی ہیں اور اپنے ماحول کے مطابق گزرے ہوئے حالات کے لحاظ سے استخراجِ نتائج میں اپنے پیش رووں کے ٹھوس اور عمیق افکار سے مدد لے کر اُن کی دماغی کاوشوں کا (خواہ وہ ملکی پالیٹکس سے تعلق رکھتی ہوں خواہ تعلیماتِ عامہ یا بہبودیٔ قوم کے دیگر امورِ مہمات سے) غرض ہر طرح سے خیر مقدم کرنے میں پیش قدمی کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ مہذب اور تعلیم یافتہ دنیا طرح طرح سے اپنی قوم کے دانشوروں کے خیالات کی اشاعت کرتی رہتی ہیں؛ گویا اس طریقہ سے گزرے ہوئے لوگوں کا پیغام آنے والی نسلوں کو پہنچا کر ان میں عمدہ تعلیم، بہتر تربیت، پاکیزہ اخلاق کی تخم ریزی کر کے اُن کی نشوونما میں مصروف نظر آتی ہے۔

الفہرس

عکسی خزانۂ نوادر

دیباچہ

مولانا سید سلیمان اشرف کا یہ خصوصی خطاب آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اٹھائیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۱۴ء بمقام راولپنڈی ہوا۔ اس اجلاس کی صدارت مولوی حاجی سر رحیم بخش[1] مرحوم نے کی۔ یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ ایجوکیشنل کے تمام اجلاس ہر سال باقاعدہ متحدہ ہندوستان کے مختلف مقامات پر منعقد ہوتے رہے، جن میں پورے ہندوستان سے مختلف علاقوں میں رہنے والے

---

[1] رحیم بخش، مولوی سر: (تقریباً ۱۸۶۱-۳۰ مئی ۱۹۳۵ء) بوطن ٹھکا میراں جی (ضلع کرنال)۔ نارمل اسکول سے تعلیم حاصل کی۔ شہر انبالہ میں پندرہ روپے ماہوار پر مدرس مقرر ہوئے ترقی کر کے چیفس کالج لاہور میں ۱۲۵ روپے مشاہرے تک پہونچے۔ نواب صادق محمد خاں رابع والئی بہاولپور چیفس کالج میں آئے، تو مولوی صاحب ان کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ چنانچہ وہ انھیں بہاولپور لے گئے جہاں ۱۸۹۷ء تک ۴۰۰ روپے ماہوار تنخواہ ہوئی۔ پھر کسی معاملے میں اختلاف رائے کی بنا پر مولوی رحیم بخش صاحب نے استعفا دے دیا۔ نواب صاحب نے پچاس روپے ماہوار وظیفہ تاحیات مقرر کر دیا۔
۱۹۰۳ء میں نواب بہاول خاں پنجم نے پھر بہاول پور بلالیا، جہاں مشیر امور خارجہ مقرر ہوئے۔ نواب موصوف نے حج سے واپسی پر انتقال کیا تو ان کے جانشین کی کم سنی میں مجلسِ نیابت (کونسل آف ریجنسی) بنی جس کے صدر مولوی صاحب مقرر ہوئے۔ اپریل ۱۹۲۳ء میں ۲۰،۰۰۰ روپے نقد انعام اور ۱۰،۰۰۰ سالانہ وظیفے پر ریاست کی خدمات سے سبکدوش ہوئے۔ تمام تعمیری، اصلاحی، تعلیمی اور مذہبی اداروں سے انھیں وابستگی تھی۔
مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ندوۃ العلماء، راجپوت کانفرنس سب کی صدارت کی۔ ان کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ مرکزی انجمن تبلیغ اسلام کی بنیاد استوار کی۔ انجمن اصل میں میر غلام بھیک نیرنگ، کنور عبدالوہاب خاں اور مولوی رحیم بخش ہی کی ممنونِ احسان تھی۔ مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کے لیے یک مشت ۱۰،۰۰۰ روپے جیب سے دیے۔ ہزاروں روپے مساکین کو بھی دیتے تھے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد حکومت پنجاب نے انھیں بہ اصرار مجلسِ وضع قانون کا رکن نامزد کیا۔ (اردو جامع انسائیکلوپیڈیا، جلد اول۔ ناشر شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۸۷ء، ص ۶۶۲)

اور قومی ترقی کے خواہش مند افراد شرکت کرتے۔ کانفرنس کے شاندار اجلاس پشاور اور راولپنڈی سے ڈھاکہ اور رنگون تک اور دلی سے کراچی، بمبئی اور مدراس تک منعقد ہوئے جن سے ملک کے طول و عرض میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ کل ہند سطح پہ مذکورہ کانفرنس کب اور کیوں کر قائم ہوئی، کانفرنس کے اغراض و مقاصد کیا تھے؟ تفصیلاً بیان کرتے ہیں کہ نسل نو آگاہ ہو سکے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قیام اور اغراض و مقاصد:

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام (جسے بعد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا نام دیا گیا، مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے قیام ۲۴ رمئی ۱۸۷۵ء کے گیارہ سال سات مہینے بعد) دسمبر ۱۸۸۶ء میں عمل میں آیا۔ اس ادارے کے بنیادی مقاصد میں علی گڑھ کے علاوہ دیگر علاقوں کے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات پر غور و خوض کرنا اور ان میں مغربی تعلیم کے حصول کا شوق اور اپنی تعلیمی پس ماندگی[1] کو دور کرنے کا شعور پیدا کرنا شامل تھے۔

سیّد الطاف علی بریلوی (م: ۲۴ رستمبر ۱۹۸۶ء) علی گڑھ یونی ورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے۔ وہ سر سیّد کی انجمن آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے پندرہ سال (۱۹۳۵ء سے ۱۹۵۰ء تک) وابستہ رہے۔ وہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ' سر سید علیہ الرحمۃ کی زندگی کے اہم کاموں میں سے ایک عظیم الشان کارنامہ 'مسلم ایجوکیشنل کانفرنس[2]' کا بھی ہے، جس کو انھوں نے

---

[1] متحدہ ہندوستان میں مسلمان تعلیمی لحاظ سے کس قدر پس ماندہ تھے۔ مولانا سلیمان اشرف نے اس پر ہندو اور مسلم تعلیمی تناسب کا ایک جائزہ پیش کیا ہے۔ (تفصیلی مطالعہ کے لیے دیکھیے: 'النور' علی گڑھ، ۱۹۲۱ء اور محمد صدیق: 'پروفیسر مولوی حاکم علی' ۔ لاہور، جنوری، ۱۹۸۳ء)۔

[2] 'دار العلوم علی گڑھ میں کانفرنس کے صدر دفتر کی عظیم الشان ذاتی عمارت سلطان جہاں منزل، اس کا خوشنما ہال اور نادر کتاب خانہ زمانہ دراز سے مرجعِ خلائق اور صاحبانِ علم و عمل کا ملجا و ماوا رہا۔ بڑے بڑے قومی اجتماعات ہوتے رہے، اور ترقی و فلاحِ ملی کی جدوجہد جاری و ساری رہی' ۔ (آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی صد سالہ تاریخی ڈائری ۱۸۸۶ء لغایۃ جون ۱۹۸۶ء، طبع کراچی، ص ۸)

علی گڑھ[1] کالج کھولنے کے گیارہ سال بعد ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو قائم کیا۔ گزشتہ پینسٹھ سال سے اس کانفرنس کے مقاصد کی تشریح اور ان کا اعلان مسلسل طور پر جس بلند آہنگی سے ہوتا رہا ہے اس سے مسلم قوم کا ہر فرد واقف ہے۔

اب سے ساٹھ پینسٹھ سال قبل مسلمانوں میں ایک دوسرے کے حال سے بے خبری کا یہ عالم تھا کہ ایک صوبہ تو درکنار، ایک شہر کے مسلمان بھی قومی اغراض اور قومی بھلائی کی خاطر ایک جگہ جمع ہونا اور قومی اصلاح و ترقی کی تدابیر پر کچھ سوچنا اور غور کرنا نہ جانتے تھے۔ ہندوستان کے دوسرے باشندے زمانہ کی رو کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ اور مسلمان تعلیمی، اخلاقی، مادّی غرض ہر قسم کے ترقی بخش وسائل سے ناآشنائے محض تھے۔ یہ وہ حالات تھے جن سے متاثر ہو کر مسلمانوں میں تعلیمی بیداری اور سیاسی شعور پیدا کرنے کے لیے یہ قومی ادارہ وجود میں لایا گیا۔ اور بے شبہ آج کی تمام حسیاتِ ذہنی اور انقلابِ خیالات اس کانفرنس ہی کے رہین

---

[1] 'علی گڑھ ایک پیارا نام ہے۔ سرسید ایک حدیث شریف کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''ہمارے جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشہور یہ قول ہے کہ انا مدینۃ العلم وعلی بابہا۔ پس یہ پہلا مدرسہ ہم مسلمانوں کا، جو در حقیقت علم کا دروازہ ہوگا، علی گڑھ ہی میں ہونا چاہیے۔'' (اقتباس از کمیٹی خزینۃ البضاعۃ، اجلاس نہم منعقدہ ۱۸۷۲ء بحوالہ ایم۔ وائی انصاری، پروفیسر: 'سرسید اور فن تعمیر' مشمولہ: مقالاتِ سرسیّد صدی (مارچ ۱۹۹۸ء) کراچی۔ سرسید یونی ورسٹی پریس، ص ۵۰)

نوٹ: سرسیّد، کمیٹی 'خزینۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ المسلمین' کے لائف سیکرٹری تھے۔ اس کمیٹی کا دفتر علی گڑھ کالج کے قیام تک بنارس میں رہا چوں کہ سرسیّد بسلسلہ ملازمت (۱۸۷۰ء) بنارس میں ہی مقیم تھے (حیات جاوید، حصہ اول، طبع ثانی، ص ۱۳۰)۔ سرسیّد نے اپنے مشن کی تکمیل اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کو عام کرنے کی غرض سے مذکورہ کمیٹی قائم کی تھی۔ کمیٹی کا مقصد مجوزہ کالج (اینگلو اورینٹل کالج) کے قیام کے لیے چندہ جمع کرنا تھا۔ کمیٹی نے سرسید کو کالج کے لیے فنڈ (چندہ، عطیات) جمع کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ (ایچ۔ بی۔ خان، ڈاکٹر: 'تحریک علی گڑھ تا قیام پاکستان وقرارداد مقاصد' الحمد اکادمی، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۳۵)

منت ہیں جس نے اجتماعِ ملی پر سب سے پہلے آواز بلند کی[1]۔ جلسوں کے آئین د

---

[1] اس حقیقت سے انکار نہیں چناں چہ مولانا سلیمان اشرف نے بھی ایک موقع پر علی گڑھ کے ہی فیض یافتگان (علوم مغربیہ) جنھوں نے مسلمانوں کے حقوق کے لیے اکثر آواز بلند کی، اور مستقبل میں ملک وملت کی راہنمائی کا فریضہ انجام دیا، کا تذکرہ کیا ہے، آپ فرماتے ہیں:

'یہ واقعہ ہے، حقیقت ہے اس سے انکار کرنا سورج کی روشنی سے انکار کرنا ہے کہ ہندوستانیوں کا حکومت کے سامنے آنا اپنے مطالبات کو موثر پیرایہ میں پیش کرنا ثبات وقرار سے اپنے حقوق کے طلب میں مسلسل سرگرم کار رہنا اور پھر اپنی کامیابی کے لیے ایثار وقربانی سے دریغ نہ کرنا یہ سب تعلیم انگریزی کا ثمرہ ہے۔ آئین سلطنت پر جنھوں نے نکتہ چینی کی ہے وہ انگریزی خواں ہیں حکومت خود اختیاری کا جنھوں نے نعرہ بلند کیا ہے وہ انگریزی خواں ہیں غلامی کی ذلتوں کا جس نے احساس پیدا کیا ہے وہ انگریزی خواں ہیں۔...... طرفگی یہ کہ سارے انگریزی خواں اُنھیں کالجوں کے تعلیم یافتہ اور سندیاب ہیں جن کا الحاق گورنمنٹ کی یونی ورسٹیوں سے ہے سرکاری کالج یا امدادی کالج میں تعلیم پانے سے اُن کے جذبات قومی نہ فنا ہوئے نہ مٹے'۔ (النور: ۱۹۳)

......لیکن متذکرہ طبقہ کو انگریز کی غلامی کا طعنہ دینے والے اراکین خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء ہند کے قائدین (بالخصوص مفتیانِ سیاسی) نے جب تحریک ترک موالات (۱۹۲۰ء) کے دوران آزاد قومی یونی ورسٹی کے قیام کی آڑ میں مسلمانوں کے تعلیمی اداروں جیسے اسلامیہ کالج لاہور کو نشانہ بنایا، اور اسلامیانِ ہند کی عظیم درس گاہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی پر حملہ آور ہوئے (حال آں کہ بقول ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد: 'خلافت کا کام کرنے والوں میں ۴/۳ علی گڑھ کے طلبا تھے۔ اور علی گڑھ ہی ان کی فیکٹری تھی اگر اس کو ہی تباہ کر دیا جائے تو کام کرنے والے کہاں سے ملیں گے')، تو مولانا سلیمان اشرف نے اُس وقت حقیقت حال سے پردہ اُٹھاتے ہوئے ان حضرات کو خبردار کیا کہ.....'اس وقت (یعنی تحریک خلافت وترک موالات کے دوران) علماء سیاسی میں جو خروش وجوش ہے وہ بھی نتیجہ انھیں انگریزی خوانوں کا ہے انھیں کے ہاتھوں نے انھیں جھنجوڑا، جب ان کی آنکھیں کھلیں انھیں کے ہاتھوں نے سہارا دیا جب ان کے قدم اُٹھے انھیں کی آوازوں نے ان کی زبانیں کھولیں جب یہ بولنے لگے۔..... اس وقت بھی اگر انگریزی خوان جماعت ان تحریکات سے الگ ہو جائے تو سارے جمعیت العلماء کے فضلائے یگانہ اپنی اپنی درسگاہوں میں ہوں گے یا منبر ومحراب میں کسی یتیم خانہ یا مدرسہ یا مسجد یا انجمن اسلامیہ کا وعظ فرما کر آخر میں تحریک چندہ فرماتے ہوں گے۔ وزرائے انگلستان کے آراپر تنقید اور سیاستِ ہند پر مباحثہ کسی کے وہم میں بھی نہ آئے گا'۔ (وہی حوالہ: ۱۹۴)

ضوابط اور مطالباتِ قومی پر بحث و مباحثہ کے طریقے سکھائے، اور اعلیٰ خیالات کا ایک ایسا بلند مینار تیار کیا جس پر چڑھ کر قوم نے اپنی حالت کو دیکھا، اور تباہ کن راہوں کو ترک کرکے ترقی پذیر شاہراہوں پر گامزن ہوئی'۔ [1]

آگے چل کر سید بریلوی (علیگ) مرحوم رقمطراز ہیں:۔

'کانفرنس نے اپنے مقصد اور نصب العین کے مطابق مسلمانوں میں ہر ممکن اور مناسب طریقہ سے صحیح تعلیم کو رائج کیا نہایت استقلال کے ساتھ تصنیف و تالیف و تراجم کے ذریعہ اسلامی لٹریچر اور تاریخ کی حفاظت، اردو کی ترویج و اشاعت کے ذرائع کی بہم رسانی، معلوماتِ تعلیمی کے لیے اعداد و شمار کی ترتیب و تدوین، اصلاحِ تمدن کے وسائل کی فراہمی، ہزار ہا ضرورت مند طلبا کو لاکھوں روپے وظائف، مدارس و انجمن ہائے اسلامی کا قیام، اور اُن کی ہر قسم کی امداد کے علاوہ سب سے بڑی خدمت مسلم یونی ورسٹی کو وجود میں لانے کی انجام دی۔ اسی طرح مسلم گرلس کالج علی گڑھ، ڈھاکہ یونی ورسٹی، انجمن ترقی اردو اور مسلم لیگ [2] جیسے قابلِ فخر مسلمانوں کے قومی ادارے کانفرنس ہی کی تحریک و تشویق سے معرضِ وجود میں آئے۔ تعلیم عربی اور مذہبی تعلیم کے مشہور اداروں مثلاً ندوۃ العلماء لکھنؤ وغیرہ کی امداد و اعانت میں بھی کانفرنس نے بہت بڑا حصہ لیا'۔ [3]

آئندہ سطور میں ایک اہم حوالہ ملاحظہ فرمائیں، سید معروف لکھتے ہیں:

'سر سید احمد خاں کو جب 'محمڈن کالج' کے قیام ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کی جانب سے

---

[1] آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کی صد سالہ تاریخی ڈائری: ۱۸۸۶ء لغایۃ جون ۱۹۸۶ء، مرتبہ: سید الطاف علی بریلوی (علیگ)، طبع کراچی، ص ۸، ۹۔

[2] 'سالہا سال تک کانفرنس کے ساتھ ہی لیگ کے اجلاس ہوتے رہے تا آنکہ حضرت قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں مسلم لیگ اس قدر بڑھی کہ اس کی جہد خاص سے پاکستان وجود میں آیا جو آج دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت ہے'۔ (ایضاً، ص ۹)

[3] ایضاً، ص ۹

اطمینان ہوا تو انھوں نے سوچا کہ صرف ایک کالج سے قومی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہوگا اس لیے کہ دور دراز علاقوں میں رہنے والے مسلمان ایک دوسرے کے حالات سے بے خبر ہیں اور کوئی ایسا ذریعہ نہیں کہ صوبوں اور اضلاع کے لوگ ایک جگہ جمع ہوں اور قوم کی تعلیم و ترقی کے سلسلہ میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں کہ قومی یگانگت اور ہمدردی پیدا ہو اور تعلیم و ترقی کی سمت نمائی ہو سکے۔ اسی خیال کے تحت ۱۸۸۶ء میں انھوں نے 'محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس' کی بنیاد رکھی۔ ۱۸۹۰ء میں اسے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے موسوم کیا گیا۔ ابتدا میں کانفرنس کے مقاصد حسب ذیل تھے (دیکھیے پنجاہ سالہ تاریخ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۳۷ء)

۱۔ مسلمانوں میں یوروپین لٹریچر کے پھیلانے اور اس کو وسعت دینے اور انھیں اعلیٰ درجے کی تعلیم دینے کی کوشش کرنا۔

۲۔ مسلمانوں نے جو قدیم علوم میں ترقی کی اس کی تحقیقات کرا کے شائع کرنا۔

۳۔ نامی گرامی علما اور مشہور مصنفینِ اسلام کی سوانح عمریوں کو اردو یا انگریزی میں لکھوانا۔

۴۔ مسلمان مصنفین کی وہ تصنیفات جو نایاب ہیں ان کا پتا لگانا کہ وہ کس جگہ موجود ہیں اور پھر انھیں از سرِ نو شائع کرنا۔

۵۔ تاریخی واقعات اور قدیم تحقیقات پر لوگوں کو تقریر پر آمادہ کرنا۔

۶۔ بنیادی علوم کے کسی مسئلہ یا تحقیقات پر کسی رسالہ کے تحریر ہونے یا لکچر دینے کی تدابیر کرنا۔

۷۔ فرامینِ شاہی کو بہم پہنچا کر ان سے کتابِ انشا کا مرتب کرانا اور ان کے نمونے فوٹوگراف کے ذریعہ سے قائم کرنا۔

۸۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے قائم ہیں ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور بقدرِ امکان عمدگی سے اس

تعلیم کو طلبا میں پھیلانا۔ (پنجاہ سالہ تاریخ، ص ۴-۵)[1]

آگے جانے سے پہلے اگر پروفیسر ڈاکٹر نجیب جمال کے مقالے 'یگانہ۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ' سے استفادہ کرلیا جائے، تو مذکورہ دور کے سیاسی و سماجی، تہذیبی و تمدنی، فکری و مذہبی اور علمی و ادبی پس منظر سمجھنے میں مدد ملے گی۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

'خالص علمی نقطۂ نظر سے اس عہد کو دیکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انگریزوں کے ہاتھوں پٹ جانے کے بعد ہندوستان کے لوگوں میں فکری و علمی افلاس کا احساس شدید ہو گیا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب قدامت اپنی تمام بچی کھچی قوت اور توانائیوں کو سمیٹ کر جدیدیت سے ٹکرا گئی تھی۔ فکری و علمی افلاس اپنے ساتھ غلامی، محکومی اور نقاہت لے کر آیا۔ ایسے میں ایک طرف تو وہ طبقہ تھا جو پرانے معیاروں ہی کو سب کچھ جانتا تھا اور دوسری طرف وہ لوگ تھے جو روحانیت کے مقابلے میں مادّیت کی طرف جھکتے جا رہے تھے (؟) [جھکے] اور

....

[1] محمد معروف، سید۔ مضمون بعنوان 'انجمن ترقی اردو: مختصر تاریخی جائزہ' مشمولہ: ادب و کتب خانہ، کراچی: بزم اکرم، ۲۰۱۴ء، ص ۴۰۔

[2] ایسے پُرخطر اور کٹھن مرحلے میں بھی ہمیں مولانا سلیمان اشرف ہی کا آہنگ سنائی دیتا ہے، جو ان کی غیر معمولی دینی غیرت و حمیت اور مومنانہ حق گوئی و بے باکی پر شاہد عادل ہے چناں چہ اپنے رسالہ 'الرشاد' میں یاد دلاتے ہیں:
'مسلمانوں کی انتہائی بدقسمتی یہی ہے کہ یہ کسی غیر قوم کی طرف اس غرض سے بڑھتے ہیں کہ اپنی حیاتِ دنیا سنوارنے کا طریقہ اُس سے سیکھیں، لیکن اس سے پیشتر کہ اُن وسائل و اسباب پر انھیں دسترس ہو دین و مذہب پہلے کھو بیٹھتے ہیں۔ مسلمانوں کا ایک عہد عیسائیت کے ساتھ تعشق و شیفتگی کا تھا مسلمان ہمہ تن اس میں حلول و جذب ہو جانے کے لیے بے تاب تھے۔ لیڈرانِ قوم نے اُس وقت نہایت بلند آہنگی سے یہ صور پھونکا تھا کہ اگر باعزت و حرمت دنیا میں رہنا چاہتے ہو تو یورپ میں جذب ہو جاؤ، مسلم ہستی بذاتِ خود قائم ہو ہی نہیں سکتی۔ اسلامی انداز جلد سے جلد چھوڑ دو اور یورپ کے اسلوب اختیار کرو۔ پھر کیا تھا مسلمانوں کی شکل و صورت، لباس و پوشاک طرز ماند و بود غرض ہر ایک شعبۂ حیات میں یورپ ہی کی تجلی تھی۔ حتّٰی کہ نام تک یورپین تلفظ و املا میں شامل کرلیا گیا، ارکانِ اسلام سے بیگانہ وشی لوازم تہذیب و تعلیم قرار پائے، عیسائیت میں جذب ہونے کے لیے مسائل شرعیہ میں طرح طرح کی تحریفیں کی گئیں، آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کے مطالب میں عجیب و غریب معنی آفرینیوں سے کام لیا گیا'۔ (الرشاد: ۱۹-۲۰)

جن میں گرد و پیش کا تجزیہ کرنے کا شعور موجود تھا، سرسید کی علمی و ادبی تحریک نے اس لمحے میں جنم لیا۔ علی گڑھ تحریک کے پس منظر میں شاہ ولی اللہ (۱۷۶۲ء۔۱۷۰۳ء) کے علمی نظریات دکھائی دیتے ہیں[1]۔ سرسید علوم عقلیہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کی تحصیل کو وقت کی سب سے بڑی ضرورت قرار دے کر علمی سطح پر اس کے فروغ کے لیے کام کیا۔ سوسائٹیاں، مدرسے اور کالج قائم کیے اور اپنے نظریات و افکار کی ترویج کے لیے اپنے بڑے بھائی سیّد محمد خاں کے فارسی اخبار 'سیّد الاخبار' سے کام لیا اور پھر خود بھی 'سائنٹیفک سوسائٹی گزٹ'[2] اور 'تہذیب الاخلاق'[3] کا اجراء کیا جنہیں برصغیر[4] (برعظیم) کی صحافتی، علمی اور ادبی تاریخ میں خاصا نمایاں مقام حاصل ہوا۔[5]

---

[1] 'سرسید نے اپنی تصانیف میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو اکثر جگہ نقل کیا ہے اور اپنے دلائل کو اس سے تقویت دی ہے'۔ (سر سیّد کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے۔ ص ۱۴۲)

[2] ۱۸۶۲ء میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی، تو اس کا ایک مقصد سرسید نے یہ قرار دیا تھا کہ ایشیا کے قدیم مصنفوں کی کمیاب کتابوں کو تلاش کر کے چھاپا جائے۔ بریلی میں ایک بار تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں کہ وہ اپنی قومی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کو کھو دے"۔ (جواب ایڈریس انجمن اسلامیہ بریلی۔ "لکچروں کا مجموعہ"، ص ۱۴۴)

سید احمد خاں سے زیادہ قومی اور تاریخی سرمایہ کی محافظت کا خیال شاید ہی ہندوستان میں کسی شخص کو پیدا ہوا ہو۔ آثار الصنادید کو لکھتے وقت ان کا جذبہ یہی تھا کہ کاروانِ رفتہ کے ایک ایک نقش کو محفوظ کر لیا جائے۔ انھوں نے فارسی ماٗخذ تاریخ کو ایڈٹ کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی، ابو الفضل کی آئینِ اکبری اور جہانگیر کی تزک کو بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ گزشتہ کم و بیش ایک صدی سے سرسید کے مرتب کیے ہوئے یہ ایڈیشن تاریخ کے طلبا کے زیرِ مطالعہ ہیں۔ ان کتب وغیرہ کو شائع کرتے وقت ان کے ذہن میں اگر کوئی بات تھی تو یہ کہ اپنے تاریخی سرمایہ کو دست بردِ زمانہ سے بچالیں'۔ (نظامی، پروفیسر خلیق احمد۔ 'سرسید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے'۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دلی، ۱۹۹۳ء۔ ص ۸۸۔۸۷ وبعدہٗ)

[3] ۱۸۷۰ء میں 'تہذیب الاخلاق' کا اجراء ہوا۔ 'تہذیب الاخلاق' نے سیاسی، مذہبی، معاشرتی، تہذیبی، علمی اور ادبی پہلوؤں کا احاطہ کیا اور ذہنی انقلاب کی راہیں کشادہ کیں۔

[4] 'لوگ Sub Continent of Indo=Pakistan کا ترجمہ برصغیر پاک و ہند کر دیتے ہیں۔

(باقی برصفحہ آیندہ)

ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے مقالہ میں اس دوران ہندوستان میں قائم کیے جانے والے بعض سرکاری وغیر سرکاری تعلیمی اداروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ: ۱۸۵۷ء کا سال ایک ایسی حد بن کر آیا جہاں قدیم اور جدید ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ دہلی کالج[1] کی تاسیس ۱۸۲۵ء میں ہوئی۔ اس سال کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونی ورسٹیاں قائم کی گئیں۔ ۱۸۶۷ء میں دارالعلوم دیوبند[2] کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۷۰ء میں لاہور میں 'اورینٹل کالج' قائم ہوا جہاں السنہ مشرقی کی

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

حالاں کہ اس میں 'بنگلہ دیش' بھی شامل ہے۔ ثانیاً جب ہم (Continent) کا ترجمہ براعظم کرتے ہیں، تو پھر Sub Continent کا ترجمہ برصغیر کیوں کر صحیح ہے۔ اعظم کا اسم تصغیر عظیم ہے صغیر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے شہرۂ آفاق مورخ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اپنی تصنیف کا نام 'برعظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ' رکھا۔ اُس وقت تک بنگلہ دیش کا وجود نہ تھا'۔ (محمد اسلم، پروفیسر: 'تحریک پاکستان' ص ۱۲)

۵ نجیب جمال، ڈاکٹر: 'یگانہ۔ تحقیقی وتنقیدی مطالعہ' لاہور، اظہار سنز۔ بار اول ۲۰۱۳ء، ص ۴۶، ۴۷۔

۱ 'دہلی کالج کی تاسیس کے مقاصد میں اگر چہ میکالے کی تعلیمی پالیسی کے علاوہ ہندوستانی کلرک سستے داموں خرید کر سیاسی بے اطمینانی کم کرنا تھا مگر بقول عتیق صدیقی: 'یہی کالج آگے چل کر مغربی علوم اور مغربی خیالات کی تبلیغ واشاعت کا مرکز اور ہماری نشاۃ الثانیہ کی تحریک کے ان نوخیز پودوں کی آب یاری کا بڑا منبع بن گیا جن کی فورٹ ولیم کالج (قائم شدہ ۱۸۰۰ء) نے تخم ریزی کی تھی۔ دلی کالج نے وقت کے شدید تقاضوں کو جس طرح پورا کیا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کالج کے فارغ التحصیل طالب علموں میں مورخ، سائنس داں، ادیب، نقاد، ریاضی داں اور اخبار نویس بھی نکلے جو اُردو اخبار نویسی کے سابق الاوّلوں میں گنے جاتے ہیں'۔ (''ہندوستانی اخبار نویسی۔ کمپنی کے عہد میں'') انڈس پبلی کیشنز کراچی، ۱۹۸۰ء، ص ۳۲۰)۔ دہلی کالج کا روشن پہلو یہ ہے کہ اس درس گاہ میں میکالے کے منصوبے کا وہ پہلو ثمر بار نہ ہو سکا جس کا مقصد ہندوستانی سر میں انگریزی دماغ رکھنا تھا'۔ (نجیب جمال، ڈاکٹر: ایضاً ص ۴۷)

۲ بقول عبدالرشید میاں: 'دلچسپ بات یہ ہے کہ علی گڑھ تحریک کے بانی سید احمد خان اور دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی دونوں ایک ہی استاد مولانا مملوک علی نانوتوی کے شاگرد تھے۔ مولانا قاسم، حاجی امداد اللہ صاحب کے سلسلۂ بیعت میں داخل تھے۔ حاجی صاحب موصوف شاہ محمد اسحاق سے فیض یافتہ تھے، جو شاہ عبدالعزیز کے نواسے اور جانشین تھے۔ حاجی صاحب ساری عمر مختلف اسلامی فرقوں کے اختلافات دور کرنے میں کوشاں رہے۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ مسائل نزاعیہ میں سے اکثر میں محض نزاع لفظی ہے، اور مقصود متحد۔ شروع میں یہ حضرات فرقہ پرستی سے بالا راہِ اعتدال پر گامزن رہے، مگر بعد میں انھوں نے اپنی مصالحت پسندانہ روش ترک کردی اور خود ایک

(باقی اگلے صفحہ پر)

تدریس کے ساتھ ساتھ یورپی علوم وفنون، جدید ہندوستانی زبانوں (عربی، فارسی، ہندی اور اُردو) کے ذریعے پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ۱۸۷۷ء میں سر سیّد نے جدید تعلیم کو فروغ دینے کے لیے 'محمڈن اینگلو اورینٹل کالج' قائم کیا جس نے آگے چل کر مسلمانانِ ہند کی فکری و علمی رہنمائی کا فریضہ ادا کیا۔ سر سیّد ہی نے ۱۸۸۶ء میں 'آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس' کی بنیاد ڈالی، جس نے 'آل انڈیا مسلم لیگ' کے قیام کی راہ ہموار کی۔[1]

....

(بقیہ حاشیہ)

فرقہ بن کر دوسرے فرقوں کے مقابل آ گئے۔ نہ صرف یہ بلکہ انھوں نے اپنے بزرگوں کی وسعت نظری کو بھی ترک کر دیا اور روحِ اسلام کو نظر انداز کر کے چھوٹی چھوٹی باتوں پر زور دینے اور لڑنے جھگڑنے لگے۔ خاص طور پر ان کے افکار مغرب (یا علومِ مغرب؟) سے بیزاری نے انھیں بہت نقصان پہنچایا۔ اپنے ذہنوں کو مسدود کر لینے کے باعث ان کے فکر کے سوتے خشک ہو گئے۔ نیز ان کی کانگرس سے وابستگی نے مسلمانوں کو بہت سیاسی نقصان پہنچایا۔ سوا مولانا شبیر احمد عثمانی اور ان کے چند رفقاء کے، ان میں سے کسی قابلِ قدر ہستی نے تحریک پاکستان کا ساتھ نہ دیا'۔ (حوالہ: پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر، مشمولہ: باب دیوبند۔ ص ۱۱۱ و بعدہٗ۔ ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور ۱۹۸۲ء)۔ افسوس اس بات کا ہے کہ جمعیت العلمائے ہند کے رول کو سراہنے والے عناصر، جواب وطن عزیز میں مولانا عثمانی مرحوم کی جمعیت علمائے اسلام کے پلیٹ فارم سے سیاست کر رہے ہیں، پاکستان کے قیام کو 'گناہ' سے تعبیر کرتے ہوئے اس مملکت کے بنانے اور اس کی حمایت کرنے والوں کو ملزم گردانتے ہیں (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔ مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم کہتے ہیں: ''مفتی محمود اور مولانا یوسف بنوری، جو کہ جمعیت العلماء ہند صوبہ گجرات کے صدر تھے، ان دونوں کا نظریہ یہ ہے کہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کو پاکستان بنانے کے جرم کی پاداش میں قبر میں عذاب مل رہا ہے''۔ (حوالہ: دی گریٹ لیڈر (اردو)۔ جلد اوّل۔ ص ۷۹۔ آتش فشاں لاہور ۲۰۱۱ء)۔

[1] 'آج ہم بآسانی دیکھ سکتے ہیں کہ سر سید نے جس سیاسی پالیسی کی بنیاد رکھی تھی، بالآخر قوم نے اسی کو اختیار کیا اور وہی کامیاب رہی۔ مسلمانانِ ہند کی فکری اور سیاسی لیڈر شپ مغربی تعلیم یافتہ اصحاب ہی نے سنبھالی۔ اقبال اور قائد اعظم دونوں اعلیٰ مغربی تعلیم سے مرصع تھے۔ انھی کی مساعیٔ جمیلہ سے پاکستان قائم ہوا۔ اور پاکستان کا قیام سر سید ہی کی پالیسی کا نتیجہ اور اس کی صداقت پر مہر ہے'۔ (عبدالرشید، میاں۔ 'پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر۔ مشمولہ: سر سید احمد خان۔ ص ۱۱۰)۔ 'حقیقت یہ ہے کہ اگر سر سید اور ان کے مغربی تعلیم کی تحریک نہ ہوتی تو مسلمان آزادی کی تحریک میں اس طرح شریک نہ ہو پاتے۔ ۱۹۰۷ء میں مولانا محمد علی نے سر سید کی روح سے یہ کہہ کر۔

سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا — جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

ایک تاریخی حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے'۔ (خلیق احمد نظامی، پروفیسر: 'سر سیّد کی فکر اور عصرِ جدید کے تقاضے'۔ ص ۱۱۰)۔

۱۹۱۷ء میں حیدر آباد میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا جس کا سہرا میر عثمان علی خاں والی حیدر آباد کے سر ہے۔ اس ادارے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تمام مغربی علوم اُردو زبان میں پڑھائے جانے لگے اس کے ساتھ انگریزی زبان کی تعلیم بھی لازمی مضمون کے طور پر برقرار رہی۔ مغربی علوم و فنون کی درسی کتابوں کے اُردو ترجموں کے لیے ۱۹۱۷ء میں 'دارالترجمہ' قائم ہوا جہاں مستند اور معیاری کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں مولانا محمد علی جوہر کی کوششوں سے 'جامعہ ملّیہ اسلامیہ' کا قیام عمل میں آیا، ۱۹۲۵ء میں اسے دہلی منتقل کر دیا گیا۔ [1]

ازیں علاوہ اسلامیہ کالج لاہور (قیام: یکم مئی ۱۸۹۲ء) اور اسلامیہ کالج پشاور (آغاز: ۱۹۱۳ء) بھی قائم کیے گئے تھے۔ سیّد احمد خان اور دیگر قائدین اس امر کو پا چکے تھے کہ صرف مسلمانوں کی ہی نہیں بلکہ ہر قوم کی ترقی و اعلیٰ کامیابی کا راز صرف مسئلہ تعلیم کے عمدہ طریقے سے حل ہونے پر مبنی ہے، اور یہ فریضہ ایجوکیشنل کانفرنس بخیر و خوبی انجام دے رہی تھی۔

یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ انقلاب حکومت اور تغیرات زمانہ سے ہر چیز اثر پذیر ہوتی ہے، اس انقلاب اور مغربی خیالات کی ترقی و اشاعت نے ہندوستان میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے مسئلہ کو نہایت اہم اور ایک لحاظ سے پیچیدہ بھی بنا دیا تھا۔ جب کہ اسلامی عہد حکومت میں قدیم و جدید علوم کی کشمکش نہ تھی یہ مسائل کبھی زیر بحث ہی نہ آئے تھے، جو اس دور میں پیدا ہو گئے۔

جیسا کہ مشاہدہ میں آیا، متحدہ ہندوستان کے طول و عرض میں جب ایجوکیشنل کانفرنس کی شاخیں قائم ہو رہی تھیں، تو بعض حساس مسلمان جو غالباً کم نظری مگر دیانت داری سے یا پھر شاید طرزِ کہن پر اڑنے اور آئینِ نو سے ڈرنے کے مصداق کانفرنس کی سرگرمیوں سے اپنے کو بچانا چاہتے تھے، کی جانب سے کچھ خدشات کا اظہار کیا جانے لگا، اور اس کے ازالہ کے لیے انھوں نے اس وقت کے اہل علم سے رجوع کرنا مناسب سمجھا اور ان کے سامنے ایک سوال استفتا [2] کی صورت

---

[1] یگانہ۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، ص ۴۸

[2] استفتا۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس سوال میں کہ اس ملک کاٹھیاواڑ میں ایک مجلس بنام کاٹھیاواڑ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس یعنی کاٹھیاواڑ کے مسلمانوں کی تعلیمی مجلس قائم ہوئی ہے جن کے محرک و مختار و متبعین و متعلقین علیگڈھ

(باقی بر صفحہ آیندہ)

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

کالج ہیں۔۲؍اکتوبر ۱۹۱۶ء کو ان کا پہلا جلسہ جونا گڈھ میں ہوا، جس کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، نظامت کے فرائض منشی غلام محمد بیرسٹرایٹ لا کاٹھیاواڑی نمائندہ علیگڈھ کالج وڈپٹی آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے انجام دیے، حاضرین جلسہ سے خطاب مشہور واعظ مولوی سلیمان پھلواروی نے کیا۔اس کانفرنس کا مقصد وحید تمام مسلمانوں کی دینی ودنیوی ترقی بتایا گیا ہے۔ایک ایسی کانفرنس جس میں جملہ مدعیانِ اسلام بشمول ایسے گروہوں کے کہ جن سے مسلمانانِ اہل سنت وجماعت کو بنیادی نوعیت کے اختلافات ہیں، ہم (بحیثیت سوادِ اعظم) کیا اس تعلیمی کانفرنس کے لیے دامے، درمے، قدمے، سخنے کسی قسم کی معاونت کرسکتے ہیں۔جواب آنے پر ان شاء اللہ تعالیٰ اس استفتا کو چھپوا کر اس ملک کاٹھیاواڑ وگجرات وبرنا وغیرہا جگہ پر بغرض اشاعت مسلمانوں میں عام طور پر تقسیم کیا جائے گا۔

فقط......راقم آثم خادم قاسم میاں عُفی عنہ

از مقام گونڈل علاقہ کاٹھیاواڑ

تاریخ ۱۲ محرم الحرام ۱۳۳۵ ہجریہ مقدسہ پنجشنبہ

ماخوذ......(استفتا: الدلائل القاہرۃ علی الکفرۃ النیاشرہ) بار اوّل ۱۹۱۷ء

بدقسمتی کیسی اس قوم کے ہمرکاب رہی ہے کہ موہوم ومفروض خدشات کو بنیاد بنا کر علومِ عصری پر رقیب اقوام کے برابر لانے بلکہ ان پر سبقت لے جانے کی سعی جمیل کے خلاف علمائے دین سے ایسے فتاویٰ حاصل کیے گئے، جن کے باعث اس راہِ روشن کو تاریکیوں سے ڈھانپ کر ملت کی منزل کھوٹی کی گئی۔ساون کے کچھ اندھوں کو آج بھی ہرا ہرا ہی سوجھتا ہے حالانکہ زمانے کے پلوں کے نیچے سے پانی اپنی پوری رفتار کے ساتھ بہتا چلا آرہا ہے۔بعض ایسے ایمان فروش مفاد پرست بھی ہیں کہ ان فتاویٰ کے پشتارے اپنی کمر پر اُٹھائے سربازار نفرتوں کی تجارت سے پیٹ کا دوزخ بھر رہے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد نے کہا تھا: 'انقلابات وحادثات نے ماضی کے بہت سے نظریات کو یا توڑ کر دیا ہے یا پھر ان پر مُہرِ تصدیق ثبت کردی ہے'۔لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ آج بھی بعض حضرات پوری استقامت کے ساتھ 'مرغ کی ایک ہی ٹانگ' پر یقین کامل رکھتے ہیں۔علامہ نے ہمارے اس مرض پر بجا طور پر کہا تھا۔

آئین نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا

منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

مقام صد اطمینان امر یہ ہے کہ ہر ہر دور میں صاحبانِ بصیرت نے بنظر غائر حقائق کو دیکھا اور رائے عامہ کی رو میں بہہ نکلنے کے بجائے اپنی بات دوٹوک انداز میں کہی بھی۔

چناں چہ فتاویٰ کی بھیڑ میں علامہ شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ کے والد گرامی حضرت مولانا محمد عبدالعلیم صدیقی میرٹھی رحمۃ اللہ (۳؍اپریل ۱۸۹۲ء-۲۲؍اگست ۱۹۵۴ء) کا فتویٰ ایک روشن چراغ کی مانند آج بھی پوری آب وتاب کے ساتھ اُن کی دُوررس نگاہ کو خراج تحسین پیش کرتا نظر آتا ہے:

(۴۹) تصدیق جناب مولٰنا مولوی محمد عبد العلیم صاحب میرٹھی زید مجدہ

مبسملاً وحامداً ومجداً (جل وعلا) ومصلیاً ومسلماً محمداً (صلی اللہ علیہ وسلم) اما بعد
کاٹھیاوار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسلمانان کاٹھیاوار کی ایک تعلیمی انجمن ہے
مسلمانوں میں علوم کی روشنی پھیلانا اور ان کو جہالت کے قعر مذلت سے نکالنا ایک ایسا ضروری واہم امر ہے
جس کے متعلق قرآن عظیم میں یوں وارد ہوتا ہے ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون
بالمعروف وینہون عن المنکر نیز ارشاد ہوتا ہے کہ یرفع اللہ الذین اٰمنوا منکم والذین
اوتوا العلم درجٰت طلب علم کے متعلق فرمان حضور عالم ماکان ومایکون صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہی ہے
کہ طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ نیز اطلبوا العلم ولو کان بالصین۔ لیکن سب سے
اہم سوال یہ ہے کہ یہاں علم سے مراد کونسا علم ہے کیونکہ مدینۃ العلوم حضرت سیدنا مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کا ارشاد
ہے کہ العلوم خمسۃ الفقہ للادیان والطب للابدان والہندسۃ للبنیان والنحو للسان
والنجوم للزمان کذا فی مدینۃ العلوم وقال الامام الشافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ العلم علمان
علم الطب للابدان وعلم الفقہ للادیان۔ سوال مذکور الصدر کا جواب آیات کلام عظیم واحادیث نبی کریم
علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے مضامین کو ترتیب دینے سے بادنیٰ توجہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں اس علم سے مراد
علم دین ہی ہے چنانچہ اسی پر مفسرین ومحدثین کا اجماع ہے اور اگر جیسا کہ بعض مؤولین معانی آیات واحادیث
کہتے ہیں کہ علوم ابدان بھی اسی میں داخل ہیں تو بھی یہ امر یقینی ہے کہ علوم دینی کو ہر طرح علوم ابدان پر
اولیت آن مؤولین کے نزدیک بھی مسلم ہوگی اسلیے معاملات تعلیم وتعلم علوم پر غور کرنے والوں کے لیے
منکم ہونا ہی نہیں بلکہ بموجب فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون اہل ذکر ہونا اور امکان رائج کا مورد
بننے کے لیے الذین اٰمنوا کا ہونا نیز طلب علم کی فرضیت کا حکم پانے والوں کے لیے مسلم ومسلمہ کا ہونا لابد ہے
پس جہاں مسائل تعلم وتعلیم پر غور کرنے کے لیے امۃ مرحومہ کے وہ افراد جمع ہوں جو یدعون الی الخیر
ویامرون بالمعروف وینہون عن المنکر اور اہل الذکر کے مصداق کہلائے جا سکیں اور تعلیمی مشورہ کے لیے
یرفع اللہ الذین اٰمنوا منکم کی ہدایت کو ملحوظ رکھ کر تحفظ ایمان واسلام واشاعت علوم دین کے فرض
اہم واولین کو محسوس کرتے ہوئے ضمناً ضرورت زمانہ کے لیے تجارت واشاعت صنعت وحرفت نیز ایسی
السنہ وکتب کے تعلم وتعلیم کے متعلق بھی مشورہ کریں جن کے حصول سے دین میں نقصان آنے کا احتمال
اضعف بھی نہ ہو تو ایسی انجمن محمود اور اس انجمن کی شرکت مسعود کہی جائے گی البتہ اگر ارکان انجمن معرا
عن الایمان وبلا ایمان ہوں اور بحث مشورہ تعلیم وتعلم علوم مخرب دین وایمان ہو تو وہ انجمن یقیناً مردود اور اس کی شرکت
سے اہل ایمان کے لیے ہر طرح گریز واجب جیسا کہ اکابر علماء کے فتاویٰ سے بوضاحت ثابت ہو چکا ہے واللہ تعالیٰ اعلم
وعلمہ جل مجدہ اکمل واتم۔ فقیر محمد عبد العلیم رضا القادری غفرلہ

رسالہ الدلائل القاہرہ کے صفحہ ۳۵ کا عکس

وما علینا الا البلاغ

مسلمانو تمہاری دین و دنیا کی بھلائی اور سچی حقیقی خیرخواہی کیلیے یہ مبارک فتوائے امام اہل سنت قامع بدعت قالع نجدیت و نیچریت مجدد مائۃ حاضرہ مؤید طاہرہ اعلیحضرت مولٰنا مولوی مفتی احمد رضا خانصاحب قادری برکاتی متع اللہ المسلمین بطول بقائہم درباره کاٹھیاوار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہدیۂ حسین بدلائل قاہرہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس میں شرکت اور کسی قسم کی امداد حرام اور سخت حرام ہے اسے بغور پڑھو اور اپنا بھلا چاہو تو اس پر عمل کرو نیز تمہارے مزید اطمینان کیلیے اس فتوے کی تائید و تصدیق میں مشاہیر علمائے ہند کے جلیل القدر فتوے مسمّٰی بہ

الدلائل القاہرۃ علی الکفرۃ النیاشرۃ

مؤلفہ

حامی سنت جناب حاجی قاسم میاں صاحب امام جامع گونڈل علاقہ کاٹھیاوار حسب فرمائش جناب منشی حاجی لعل خانصاحب نمبر ۲۲ کریا اسٹریٹ کلکتہ جناب حکیم مولوی ابو العلا امجد علی صاحب اعظمی قادری رضوی نے

مطبع اہل سنت و جماعت بریلی میں چھپا کر شائع کیا

عکس سرورق: رسالہ "الدلائل القاہرۃ علی الکفرۃ النیاشرۃ" مطبوعہ بریلی ۱۹۱۷ء

ملنے کا پتہ:- دفتر جماعت اہل سنت - محلہ سوداگران - بریلی - یو - پی -

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلٰغُ

مسلمانو تمہاری دین دنیا کی بھلائی اور سچی حقیقی خیرخواہی کیلئے یہ مبارک فتوےٰ امام اہل سنت قامع بدعت قالع نجدیت و نیچریت مجدد مائۃ حاضرہ مؤید ملت طاہرہ اعلیحضرت مولنا مولوی مفتی **احمد رضا خانصاحب** قادری برکاتی رضی اللہ تعالےٰ عنہ در بارہ کاٹھیاوار مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہے جسمیں بدلائل قاہرہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس میں شرکت اور کسی قسم کی امداد حرام اور سخت حرام ہے اسے بغور پڑھو اور اپنا بھلا چاہتے ہو تو اسپر عمل کرو نیز تمہارے مزید اطمینان کیلئے اس فتوے کی تائید و تصدیق میں مشاہیر علمائے ہند کے جلیل القدر فتوے مسمّٰی بہ

الدلائل القاهرة على الكفرة النياشرة

جسمیں مسلم لیگ کی شرکت و رکنیت و امداد و اعانت کا حکم شرعی بھی واضح و آشکار

مؤلفہ

حامی سنت جناب حاجی قاسم میاں صاحب امام جامع گونڈل علاقہ کاٹھیاواڑ

حسب فرمائش اراکین انجمن تبلیغ صداقت بمبئی

پرنٹر سلطان حسین خاں نے مطبع سلطانی ڈاکٹر ایچ ایچ عبداللہ اسٹریٹ بمبئی ۳ میں چھپایا

پبلشر

مفتی مصطفےٰ خاں قادری فیض آبادی نے شائع کیا

بار دوم ایکہزار جلد — سنہ ۱۹۴۲ء — قیمت

عکس سرورق: رسالہ "الدلائل القاہرۃ علی الکفرۃ النیاشرۃ" طبع بمبئی ۱۹۴۲ء

میں مرتب کر کے یہ جاننا چاہا کہ مذکورہ تعلیمی کانفرنس کے اجلاسوں میں ان کی شرکت یا ان کی کسی قسم کی اعانت کے بارے میں کیا حکم ہے۔

وقت تفہیم کی راہیں بناتا ہے:

سن ستاون کے بعد (بالخصوص ۱۸۶۵ اور ۱۸۷۵ء کے درمیان) مغربی تعلیم کی ترقی پزیر حالت نے علمائے کرام اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب کے درمیان خاصا اختلاف پیدا کر دیا تھا۔ تعلیمی کانفرنس کے قائدین مذکورہ احوال سے ہرگز بے خبر نہ تھے۔ اس لیے وہ اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعے پیدا شدہ خلیج کو پاٹنے کی کوشش کرتے رہے۔ امت مسلمہ کا اجتماعی مفاد ان کے پیش نظر رہا۔ یہ اختلاف بتدریج کم ہوا۔ ۱۹۲۵ء کے ایک اجلاس میں مولانا رحیم بخش اپنے خطبہ صدارت میں فرماتے ہیں:

'......افسوس ہے کہ اجتماعی حیثیت سے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے مسئلہ کی اہمیت کا صحیح اندازہ کیا گیا اور نہ ابتدا میں ان دشواریوں کو حل کرنے کی کوشش کی گئی، جو مذہبی تعلیم کی راہ میں حائل تھیں۔...... ہر زمانہ کے لیے یکساں طریقہ تعلیم مفید نہیں ہو سکتا، اسی وجہ سے ہمیشہ بہ مقتضائے حالات تبدیلیاں ہوتی رہیں اور آئندہ بھی ہوں گی۔ اس لیے ہم کو ان جدید مشکلات کے حل کرنے کے لیے بھی آمادہ ہو جانا چاہیے، تاکہ ہر جماعت اپنے دائرہ عمل کے اندر کام کرے اور قدیم و جدید تعلیم کے لیے جو نظام عمل مرتب کیا جائے وہ ایسا صاف و واضح ہو کہ اختلاف آرا کا اندیشہ کلیتاً زائل ہو جائے۔

مغربی تعلیم کی روز افزوں ترقی و اشاعت نے آخر کار مسلمانوں میں بھی ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا، جس کی آزادانہ معاشرت و عقائد نے قدیم جماعت[1] کے

---

[1] درد دل رکھنے والے علماء کرام اور ارباب دانش ہمارے علماء دین کی عمومی روش پر بجا طور پر دکھی اور رنجیدہ رہتے تھے۔ پروفیسر سید سلیمان اشرف اعلی اللہ مقامہ اس ملی مرض کہنہ کی نشان دہی کرتے ہوئے ایک محکم سند پیش کرتے ہیں:

"تغیر عالم کو دیکھتے ہوئے علماء کرام نے اپنے دل و دماغ کو سیاسیات کی فکر سے ایسا بے نیاز کر لیا تھا کہ علامہ ابن خلدون کو اس مقدس گروہ کے حق میں یہ فیصلہ دینا پڑا کہ ابعد الناس عن السیاسیۃ ھم العلماء یعنی علماء کا دماغ سیاست کے سمجھنے سے بہت ہی دور ہے"۔

(بحوالہ: النور، ص ۱۹۱)

مذہبی جذبات کو اس حد تک برانگیختہ کر دیا کہ انھوں نے ان نوجوانوں کو ملحد و زندیق قرار دیا۔ گویا مسلمانوں میں دو فریق پیدا ہو گئے جو مدت تک باہم دست و گریباں اور ایک دوسرے سے نا آشنا رہے، لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب رفتہ رفتہ یہ بے گانگی کم ہوتی گئی، اور وہ وقت آ گیا کہ فریقین اپنی اپنی جگہ پر مسلمانوں کی مختلف تعلیمی ضروریات کا احساس کر کے ایک ایسا تعلیمی نظام مرتب کریں، جو مسلمانوں کی ہر قسم کی دنیوی و مذہبی ضرورتوں پر مشتمل ہو تا کہ آئندہ تصادم کا اندیشہ نہ رہے۔ اب وہ زمانہ آ گیا کہ نہ تو انگریزی پڑھنا کفر و الحاد خیال کیا جاتا ہے اور نہ مذہبی تعلیم کی ضرورت سے کسی کو انکار ہے، اس لیے کیوں نہ فریقین باہمی معاونت سے کام کریں تا کہ ایک طرف تو مسلمانوں میں جدید علوم و فنون کا رواج ہو اور دوسری طرف ان کا سینہ مذہبی علوم سے منور ہو، اور اسلامی تہذیب و شائستگی ان کا شعار ہو۔

علماء کو بھی اب جدید تعلیم کی ضرورت سے انکار نہیں ہے، اور ندوۃ العلماء[1] کے پلیٹ فارم پر تو بارہا اس کا اعلان کیا گیا کہ وہ انگریزی تعلیم کو صرف قولاً ہی ضروری نہیں سمجھتا بلکہ اس نے اپنے دار العلوم میں انگریزی کو بطور زبان ثانی داخل[2] کر کے عملاً بھی اس کا ثبوت دیا ہے کہ علماء کے لیے بھی مذہبی نقطۂ نظر سے انگریزی

---

[1] ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں ندوۃ العلماء قائم ہوا جس کا مقصد قدیم علماء اور علی گڑھ کے مدبرین کے انتہائی نقطہ ہائے نظر میں اعتدال اور توازن کا راستہ تلاش کرنا تھا اور اس کے ساتھ نصاب تعلیم کی اصلاح، علوم دین کی ترقی، تہذیب اخلاق، شائستگی اطوار کا فروغ، علماء کے باہمی نزاعات کا رفع کرنا اور عام مسلمانوں کی اصلاح و فلاح اس کے مقاصد تھے۔ اردو زبان کا سب سے بڑا اسلامی رسالہ 'معارف' ندوہ کی نشانیوں میں سے ہے'۔ (نجیب جمال، ڈاکٹر: یگانہ۔ تحقیقی و تنقیدی مطالعہ۔ ص ۴۴، ۴۵)

[2] 'ندوہ نے تکملہ علوم عربیہ و دینیہ کے ساتھ تعلیم انگریزی بھی داخل نصاب کی تا کہ اس مدرسہ کا فارغ التحصیل طالب العلم اگر انگریزی تعلیم حاصل کرنا چاہے تو پانچ برس میں گریجویٹ ہو جائے اور اگر مطالعہ و محنت سے کام لے تو اس قدر استعداد اُس میں موجود ہے کہ بغیر داخلہ کالج قوت مطالعہ سے ہر طرح کا فائدہ کتب انگریزی سے حاصل کر سکے۔ ندوۃ العلماء کے سند یافتہ اس وقت ملک میں موجود ہیں اُن کی لیاقت و فضل کا ثبوت اُن کی مصنفہ کتابوں سے ملتا ہے'۔ (محمد سلیمان اشرف: 'النور' علی گڑھ ۱۹۲۱ء، ص ۱۹۸)

ایسی ہی ضروری ہے جیسی عام مسلمانوں کے لیے، البتہ ندوہ کی یہ خواہش ضرور ہے کہ انگریزی تعلیم اسلامی تربیت کے ساتھ دی جائے، اور انگریزی خواں جماعت، اسلامی عقائد وروایات سے باخبر ہو، اس کا مقصد سادہ الفاظ میں یہ ہے کہ مسلمان مسلمان رہ کر انگریزی حاصل کریں، اگر وہ ایسا کرسکیں تو اسلام ان کو کسی زبان اور کسی علم وفن کے سیکھنے سے منع نہیں کرتا، تاریخ اسلام میں بکثرت ایسی مثالیں موجود ہیں کہ مسلمانوں نے دوسری قوموں کے علوم وفنون سیکھے بلکہ ان علوم میں یہاں تک کمال حاصل کیا کہ استاد اور امام کے درجہ تک پہنچے۔[1]

سیّد سلیمان اشرف کا چشم کشا خطاب:

مذکورہ حوالہ کے بعد اگر الخطاب (۱۹۱۴ء) سے درج ذیل اقتباس کا مطالعہ کرلیا جائے، تو ناظرین کرام کو احساس ہوگا کہ وہ مسلمان جو علومِ مغربی کو یعنی یورپ کا تمدن، سائنس سب کچھ کفر قرار دیتے[2] (کہ مسلمانوں کو اسلام کے اساسی منابع کی طرف لوٹنا چاہیے) تھے، کہاں کھڑے تھے؟ سید العلما مولانا سید سلیمان اشرف تمدن، سائنس اور قرآن مجید کے تحت فرماتے ہیں:

> 'پس اے عزیزو، کیا تمدن کی روح اس کے سوا اور چیز ہے؟ کیا سائنس الٰہی اس امر کو منکشف نہیں کرتا کہ کس چیز کو ہم کس طرح اپنے کام میں لائیں؟ اگر یہی بات ہے اور ضرور یہی ہے، تو میں ڈنکے کی چوٹ سے کہتا ہوں کہ تمدن و سائینس کی سنگ بنیاد قرآن کریم کی یہی تعلیمات ہیں۔ سائینس پڑھنا، اس میں

---

[1] صدارتی خطبہ الحاج مولانا سر رحیم بخش: اجلاس بستم (۲۰واں) ندوۃ العلماء لکھنؤ منعقدہ ۲۸ نومبر ۱۹۲۵ء بمقام انبالہ، بحوالہ تاریخ ندوۃ العلماء (حصہ دوم) مرتبہ: شمس تبریز، مولوی۔ طبع لکھنؤ، بار اول ۱۹۸۴ء، ص ۲۹۳ وبعدہٗ۔

[2] مولانا سلیمان اشرف نے جب یہ دیکھا کہ مسلمان انگریزی تعلیم کی مخالفت اس لیے کر رہے ہیں کہ ان کے خیال میں ایک غیر ملکی اور غیر مسلم قوم کی زبان سیکھنا مذہباً جائز نہیں تو آپ نے مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کی، پُرزور مضامین اور خطبات کے ذریعے ایسے اوہام وخیالات فرسودہ کی نہ صرف تردید کی بلکہ ثابت کیا کہ مذہب علومِ جدیدہ کا مخالف نہیں ہے۔ اس طرح مسلمانوں میں سرسید کی تعلیمی کانفرنس کے خلاف نفرت میں کمی پیدا ہوئی اور تحریک علی گڑھ کو تقویت ملی۔

کمال پیدا کرنا، حقیقت میں مسخرہ مخلوق سے مستفید ہونا ہے، اور اُن کے مسخر ہونے کو بامعنی بنانا ہے۔ کوئی وجہ اس کی نہیں کہ قرآن ہمیں جن اُمور کی طرف رہنمائی کرے جن سے بہرہ مند ہونے کی ترغیب دلائے ہم اُسے مذہب کے خلاف سمجھیں۔ پھر تو کھانا پینا، پہننا، رہنا سب ہی دشوار ہو جائے گا۔ رہی یہ بات کہ کون سی زبان میں ان علوم کو پڑھیں؟ اس تنگ وقت میں زیادہ بحث کا تو موقع نہیں لیکن اس قدر سمجھ لیجئے کہ اُردو، فارسی، پنجابی، پشتو، بنگلہ وغیرہ وغیرہ تو جائز ہوں مگر یورپ کی زبان حرام آخر اس کی وجہ؟ اگر آج تمام یورپ یا کوئی اُس کا حصہ دائرۂ اسلام میں آ جائے تو کیا اُسے اپنی مادری زبان کا بولنا یا اُس میں پڑھنا حرام ہو جائے گا؟ کیوں خدا کی رحمت کو اس قدر تنگ کیا جائے؟ اور ترجیح بلا مرجح دی جاوے؟ الحکمۃ ضالۃ المؤمن حکمت مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ اپنی چیز جہاں تمھیں مل جائے اُسے فوراً اُٹھالو۔

سخن کز بہر حق گوئی چہ عبرانی چہ سُریانی

مکان کز بہر او جوئی چہ جابلقا چہ جابلسا [1]

ایک غلط فہمی کا ازالہ:-

یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ بعض مسلم راہنماؤں کا خیال تھا اور بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی، 'وہ یہ سمجھتے تھے کہ سید احمد خاں مشرقی علوم کے دشمن ہیں اور اپنی ہر قومی چیز کی قیمت پر غیر ملکی چیز کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں [2]۔ سید احمد خاں کی پوری زندگی، ان کی تصانیف کا ایک ایک حرف اس خیال کی تردید کرتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ مشرق کی ہر عمدہ چیز کو باقی رکھا جائے لیکن مغرب کی بھی کسی اچھی چیز کے حاصل کرنے میں گریز نہ کیا جائے۔ امرتسر میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے ایک بار کہا تھا:

'مسلمانوں کو بھی یہ لازم ہے کہ عربی زبان کی تحصیل نہ چھوڑیں۔ یہ ہمارے باپ دادا کی مقدس زبان اور ہمارے قدیم ملک کی زبان ہے۔ جو فصاحت و بلاغت میں سمٹک [3] (Semtic) زبانوں میں لاثانی ہے مگر افراط و تفریط نہ ہو۔ اس زبان میں ہمارے مذہب کی ہدایتیں ہیں لیکن جب کہ ہماری معاش، ہماری بہتری، ہماری

---

[1] الخطاب، ص ۲۲،۲۳ [2] آثار جمال الدین افغانی، ص ۱۴۱-۱۴۲ [3] سامی زبان۔ زبانوں کے افریقیشیائی قبیلے کی شاخ جس میں عبرانی، فنیقی، ارامی، اکادی، عربی اور حبشی زبانیں شامل ہیں۔

زندگی با آرام بسر ہونے کے ذریعہ بلکہ ہمارے اس زمانے کے موافق انسان بنانے کے وسائل انگریزی زبان سیکھنے میں ہیں تو ہم کو اس طرف بہت توجہ کرنی چاہیے۔" [1]

الغرض بقول انور معین زبیری، متذکرہ دور میں مسلمان خود مغربی علوم وفنون کو اپنے لیے ایک زبردست خطرہ سمجھتے تھے اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے اداروں کو کم زور کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ [2] حال آنکہ ان تعلیمی اداروں کا قیام اور علوم کا حصول مسلمانوں کے مفاد میں تھا، مولانا سلیمان اشرف رقم طراز ہیں:

"انگریزی سلطنت جب اپنے ساتھ علوم مغربیہ ہندوستان میں لائی تو ہندوستانیوں نے دیکھا کہ اب بقا اور نمود کی زندگی بغیر علوم مغربی حاصل کیے ناممکن ہے، تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا اور ہندوؤں نے بڑھ کر تعلیم انگریزی کا استقبال کیا اور خوش آمدید کا نعرہ بلند کیا۔ جب اس قوم کے ایک خاص حلقہ میں یہ تعلیم پھیل گئی اور انگریزی کے واقف کار کچھ ہندوؤں میں تیار ہو گئے تو اُن میں احساس پیدا ہوا اور حکومت کے انداز فرماں روائی پر نکتہ چینی شروع کی اپنے حقوق کے باب میں صدائے احتجاج بلند کی ہوم رول سلف گورنمنٹ یا سواراج کا تخیل سب سے پہلے علم مغربی سے آشنا دماغ میں آیا۔ حکومت خود مختاری کی صدا جس نے اپنے مُنھ سے نکالی اور ہندوستان کے رہنے والوں کو یہ سامعہ نواز نغمہ جس نے سُنایا وہ انگریزی دان ہندوستانی تھا۔ کانگریس جو سواراج کا سنگِ بنیاد ہے اس کی تاسیس اور پھر اس عمارت کی تعمیر و تکمیل جن ہاتھوں نے کی ہے وہ سب انگریزی خواں اور انگریزی داں ہیں۔ مسلمانوں میں جب علوم مغربیہ کا آغاز ہوا اور پھر ان میں بھی ایک تعداد

---

[1] تقریر بمقام امرتسر بتاریخ ۲۹ر جنوری ۱۸۸۴ء ("لیکچروں کا مجموعہ" ص ۱۸۴) بحوالہ سرسید کی فکر اور عصرِ جدید کے تقاضے، طبع دہلی، ۱۹۹۳ء، ص ۸۷۔

[2] ماضی کے واقعات اس غرض سے فراہم کیے جاتے ہیں کہ آنے والی نسلیں ان سے فائدہ اُٹھائیں اور ان کی روشنی میں اپنے طرزِ عمل کو درست کر سکیں۔ ماضی کے واقعات قابلِ فخر بھی ہیں اور باعثِ عبرت بھی، جو ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ (ظہور الدین)

تعلیم یافتوں کی تیار ہو گئی تو احساس و تاثیر یہاں بھی ظاہر ہونے لگے لیکن افسوس ع

ہم اُبھرتے ہوئے جھونکے میں خزاں کے آئے

(النور، علی گڑھ ۱۹۲۱ء، ص ۱۹۲، ۱۹۳)

ڈاکٹر ایچ۔ بی۔ خان نے بھی اپنے مقالہ (تحریک علی گڑھ تا قیام پاکستان وقرارداد مقاصد) کے آغاز میں لکھا کہ: "لیکن جو قوم یا قومیں تھکن، اضمحلال اور ناکامی سے صرف اس قدر سبق لیتی ہیں کہ ذرا تھوڑا آرام کرنے کے بعد پھر قوائے مضمحل کو تر و تازہ کر کے اور پھر سرگرم عمل ہو جائیں وہ نہ مردہ ہوتی ہیں اور نہ گمنام و بے صدا، بلکہ وہ اپنی تھکاوٹ اور پس ماندگی کے زمانہ تک آرام کر کے تر و تازہ اور ہشاش بشاش ہو کر حوصلہ، عزم، استقلال، جرأت اور مردانگی کے ساتھ اٹھتی ہیں اور پھر اپنی عظمت رفتہ اور چھینے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے سب کچھ قربان کر دیتی ہیں"۔

ایجوکیشنل کانفرنس کے حوالہ سے بات ذرا آگے نکل گئی، تو یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ ۱۸۹۰ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ہندوؤں کی کانگریس کی طرح مسلمانوں کی ایک اہم جماعت کے طور پر متعارف ہو گئی تھی، جس کی بدولت علی گڑھ مسلمانوں کی ہر طرح کی علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی علم افروز سرگرمیاں اہل علم کی نظر میں:

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اسلامیانِ ہند کی پس ماندگی کا ادراک کرتے ہوئے ہندوستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں مسلم گرلز اور مسلم بوائز اسکولوں کا جال بچھا دیا، اسلامیہ کالج بھی قائم ہونے لگے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تعلیمی میدان میں بھی مسلمان، ابنائے وطن سے بہت پیچھے تھے۔ جب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس وقت تک مسلمانوں کی حالت نہایت ابتر تھی، کیونکہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانانِ ہند زوال پذیر[1] ہونا شروع

---

[1] زوال پذیر قوم جبکہ وہ ماضی میں اقبال مند اور صاحب اقتدار و اختیار رہی ہو، تو انحطاط کے دور میں اس کی تمام تر علمی، ملی، صنعتی و حرفتی، سائنسی، زراعتی، تجارتی، معاشرتی اور معاشی اور دیگر اس قسم کی ترقی و خوشحالی ماند پڑ جاتی ہے، تو وہ مضمحل اور مایوس ہو کر دوسری اقوام کی ترقی و خوشحالی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ (ایچ۔ بی۔ خان، ڈاکٹر: تحریک علی گڑھ تا قیام پاکستان وقرارداد مقاصد، ص اوّل)

ہو گئے اور اغیار کی محکومیت اختیار کر کے وہ بے شمار معاشی، سیاسی، اقتصادی، تمدنی، ثقافتی، معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی بیماریوں میں مبتلا ہو چکے تھے۔ مرحوم ضیاء الدین اصلاحی، علی گڑھ تحریک پس منظر اور پیش منظر کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی کی ناکامی کے بعد جب مسلمان بے شمار مشکلات و مصائب میں گھر گئے تو انہیں تباہی و بربادی سے بچانے کے لیے علی گڑھ تحریک وجود میں آئی۔ اس کا مقصد ان کی 'نشاۃ ثانیہ' اور ہر شعبۂ زندگی میں اصلاح و انقلاب برپا کرنا تھا چنانچہ مسلمانوں کی مذہبی سیاسی، تہذیبی اور تعلیمی زندگی پر اس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے"۔ [۲]

سرسید نے تعلیم کو ان تمام روگوں کا علاج سمجھا۔ مولانا سلیمان اشرف نے اپنے لکچر میں مسلم معاشرہ میں در آنے والی ان خرابیوں کا ذکر بھی کیا ہے اور علم کے اُجالے سے ان کے تدارک کی سعی انجام دی ہے۔ جناب آزاد بن حیدر 'تاریخ آل انڈیا مسلم لیگ۔ سرسیدؒ سے قائداعظمؒ تک' میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پس منظر میں یوں رقمطراز ہیں:

---

[۱] "ہندوستان سے مسلمانوں کی سلطنت جب زائل ہوئی اور ۵۷ء کے واقعہ نے ان کی آنکھیں کھولیں تو انہیں معلوم ہوا کہ سلطنت کے ساتھ کمالات و محاسن بھی ان سے رخصت ہو گئے۔ جب اپنی سلطنت علومِ اسلامیہ کی حمایت و حفاظت کے لیے نہ رہی تو ترقی کے سارے زینے ٹوٹ گئے اور مسلمانوں کے علوم و فنون کی عمارت منہدم ہو گئی۔ جب سلطنت جاتی ہے تو محاسن و کمال صرف اُس قوم سے رخصت ہی نہیں ہو جاتے بلکہ کافی مدت کے لیے اُسے دامِ حیرت میں ایسا گرفتار کر جاتے ہیں کہ وہ قوم اس انقلاب کلی سے متاثر ہو کر عالمِ سراسیمگی میں ششدر و حیران ہوتی ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا"۔ (محمد سلیمان اشرف، پروفیسر مولانا۔ "النور" ص ۱۸۴، ۱۸۵!)۔ ۱۸۵۷ء کا طوفان آیا تو یہ ریت کے تودے ذروں کی طرح ہوا میں اڑتے نظر آئے، نہ سیاسی وحدت کا وجود رہا اور نہ کوئی ملی جمعیت کا نشان، حکمراں طبقے انقلاب کی بھینٹ چڑھے، آبرو والے بے آبرو ہو گئے، دوسروں نے نئے آقاؤں کی غلامی کا جُوا پہنا، مسلمان قوم مر گئی گو مسلمان کروڑوں کی تعداد میں چلتے پھرتے نظر آتے رہے۔ سرسید احمد خاں نے نئے سرے سے قوم کو زندہ کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ کروڑوں مسلمان صرف بے جان اور بے روح ہی نہ تھے بلکہ ان میں کوئی جماعتی شعور بھی باقی نہ رہا تھا"۔ (محمد سرور۔ 'مضامین محمد علیؒ': مقدمہ، صفحہ الف)۔

[۲] معارف، اعظم گڑھ (بھارت) شمارہ ۵، جلد ۱۴۷، مئی ۱۹۹۱ء، مشمولہ: مقالہ سرسید اکادمی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا سیمنار، ۲۹ر اپریل تا یکم مئی ۹۱ء، ص ۳۸۴

برعظیم پاک و ہند میں ۱۸۵۷ء کی جدوجہد آزادی کے بعد سر سید احمد خاں نے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ اور احیائے نو کے لیے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا۔ اس کالج کے قیام کے پس پردہ یہ مقاصد تھے کہ یہ کالج مسلمان نوجوانوں کو جدید تعلیم و تربیت سے آراستہ کرے اور یہاں پر طلبہ کو ہر طرح کی سہولتیں میسر ہوں اور یہ کالج طالب علموں میں انقلابی اور سیاسی شعور پیدا کرنے میں بھی اپنا کردار ادا کرتا رہے۔ اس کالج کے قیام کے بعد انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس بھی قائم کی۔ اس کانفرنس کے ہر سال اجلاس منعقد ہوتے اور ان اجلاسوں میں وہ اپنے مسائل اور سیاسی صورتِ حال پر بھی بحث کرتے تھے[1]۔ گویا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس مسلمانانِ برعظیم کے لیے ایک موثر اور عمدہ اسٹیج تھا کہ جہاں سے وہ اپنے حقوق کے لیے کچھ کر سکتے تھے۔[2]

مزید لکھا گیا ہے:

'ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تعلیمی انجمن 'محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس' تھی۔ جبکہ تحریک علی گڑھ نے قوم میں جوش و خروش پیدا کیا جس کی مثال انیسویں صدی میں ملنا مشکل ہے۔ اس تحریک میں جن سربرآوردہ شخصیتوں نے سر سید کا ساتھ دیا،[3] ان کے نام یہ ہیں: نواب محسن الملک (اصلی نام مہدی علی خاں

---

[1] 'آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۶ء کو علی گڑھ میں ہوا۔ کئی اجلاس منعقد ہوتے رہے ایک سالانہ اجلاس ہز ہائی نس سر آغا خاں کی صدارت میں دہلی میں ۲۷ر دسمبر ۱۹۰۲ء سے ۴ر جنوری ۱۹۰۳ء تک ہوا۔ اجلاس کے ممبروں کی تعداد ۱۰۳۶۱ اور وزیٹروں کی تعداد ۳۱۰ تھی جنھوں نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ (پنجاہ سالہ تاریخ، ص ۸۸۔۸۹) اس وقت تک کانفرنس کے تین شعبے تعلیم نسواں، تعلیمی مردم شماری اور مدارس تھے۔ دہلی اجلاس میں تین مزید شعبے سوشل ریفارم، ادبی شعبہ، امور متفرقات شامل ہوئے'۔ (محمد معروف، سید۔ مضمون 'انجمن ترقی اردو، مختصر تاریخی جائزہ'، مشمولہ: رسالہ ادب و کتب خانہ، کراچی، ۲۰۱۴ء، ص ۴۱)

[2] تاریخ آل انڈیا مسلم لیگ۔ سر سیدؒ سے قائداعظمؒ تک: آزاد بن حیدر، طبع اول۔ کراچی، ۲۰۱۳ء، ص ۱۵۸

[3] مولانا ابوالکلام آزاد نے سر سید اور ان کے مصاحبین کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا: 'مرحوم سر سید اور ان کے ساتھیوں نے علی گڑھ میں صرف ایک کالج ہی قائم نہیں کیا تھا، بل کہ وقت کی تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں کے

(باقی برصفحہ آئندہ)

ہے)، نواب وقار الملک، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ، نذیر احمد، مولوی زین العابدین، محمد اسمٰعیل خان، الطاف حسین حالی اور مولانا شبلی نعمانی۔

۱۸۹۸ء میں سرسید کے انتقال کے بعد ان کے ساتھی ان کے کام کو جاری رکھتے ہوئے آل انڈیا سیاسی تنظیم بنانے کی مسلسل کوششیں کرتے رہے جس کی وجہ سے مسلمان راہنما ایک دوسرے کے اور قریب آ گئے۔[1]

سرسید کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے مذکورہ بالا حضرات کی تحریریں، مضامین اور تقاریر جو تہذیب الاخلاق وغیرہ میں شائع ہوئیں وہ اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ تعلیمی کانفرنس کے اجلاسوں میں پڑھے جانے والے خطبات (اور ان میں پاس ہونے والی قراردادیں) جو چالیس بیالیس سالوں پر محیط ہیں ۱۹۲۷ء میں مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی المخاطب بہ نواب صدر یار جنگ بہادر کی تحریک پر مولوی انوار احمد صاحب زبیری (مارہروی) نے خطباتِ عالیہ کے نام سے تدوین و ترتیب دیے۔ یہ خطبات علی گڑھ سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زیر اہتمام شائع ہوئے۔ خطبات کے مقدمہ میں مولانا محمد اکرام اللہ خاں ندوی[2] شاہجہانپوری (م: ۱۹۵۲ء) لکھتے ہیں: 'ابتدا میں لوگ زیادہ تر سرسید، نواب محسن الملک، مولانا حالی، مولانا نذیر احمد

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

لیے ایک ترقی پسند حلقہ پیدا کر دیا تھا۔ اس حلقہ کی مرکزی شخصیت خود ان کا وجود تھا اور ان کے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہو گئے تھے۔ اس عہد کا شاید ہی کوئی قابلِ ذکر اہلِ قلم ایسا ہوگا جو اس مرکزی حلقہ کے اثرات سے متاثر نہ ہوا ہو۔ جدید ہندوستان کے بہترین مسلمان مصنف اسی حلقہ کے زیرِ اثر پیدا ہوئے اور یہیں نئے قسم کی اسلامی تحقیق و تصنیف کی راہیں پہلے پہل کھولی گئیں'۔ (حوالہ: سرسید کی فکر اور عصرِ جدید کے تقاضے از پروفیسر خلیق احمد نظامی، طبع بھارت۔ ۱۹۹۳ء، ص ۳۰ اور ۱۴۷، ۱۴۸)

[1] تاریخ آل انڈیا مسلم لیگ۔ سرسیدؒ سے قائدِ اعظمؒ تک، ص ۸۲، ۸۳

[2] بقول مولوی انوار احمد زبیری، مولانا اکرام اللہ خاں ندوی عربی ادب کے ذوق آشنا اور زبان اردو کے پختہ کار ناثر (مضمون نگار) ہیں۔ مولانا سلیمان اشرف نے ۱۹۲۴ء میں جب علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے نصاب تعلیماتِ اسلامیہ کے لیے تجاویز مرتب کیں، تو ندوی صاحب موصوف نے اس کی تحسین کی اور عربی علم ادب کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے اُسے مفید و منفعت رساں قرار دیا۔ (السبیل: ۳۰)

اور علامہ شبلی جیسے یگانۂ روزگار مشاہیر کے دیکھنے اور اُن کا لکچر یا کلام سننے کے لیے آتے تھے......

۱۸۹۳ء میں جب کانفرنس کا آٹھواں اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا اور نواب محسن الملک صدر منتخب ہوئے تو خطبہ صدارت میں ایک خاص وسعت و شان پیدا ہو گئی۔ یہ (گزشتہ اجلاسوں کی نسبت) سب سے پہلا خطبہ تھا جس میں زورِ بیان اور جوش پایا جاتا ہے اور انشا پردازی کی ایک خاص جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً نواب صاحب ایک موقع پر نکتہ چینوں کے جواب میں فرماتے ہیں:۔

"مانا کہ ہم نے مغربی علوم کا شوق دلا کر مسلمانوں کو خراب کیا۔ مانا کہ ہم نے انگریزی تعلیم و تربیت کے جاری کرنے سے الحاد پھیلایا۔ مانا کہ ہم نے کانفرنس قایم کر کے مسلمانوں کو بہکایا، مگر ہم پر طعنہ کرنے والے خدا کے لیے یہ بتا دیں کہ اُنھوں نے اپنی قوم کے لیے کیا کیا، اور اس ڈوبتی ہوئی کشتی کے بچانے میں کون سی کوشش کی؟ اگر ہم نے مسلمانوں کے لیے دیر و کنشت بنایا، مانا کہ گناہ کیا۔ مگر یہ فرمایئے کہ اُن کا بنایا ہوا بیت المقدس کہاں ہے جہاں جا کر ہم سجدہ کریں؟ اگر ہم نے اپنے بھائیوں کے واسطے ایک قومی کانفرنس قایم کی، ہم قبول کرتے ہیں کہ ایک بے سود کام کیا۔ مگر ہمارے دوست براہ مہربانی یہ فرما دیں کہ اُنھوں نے قوم کے حال پر مرثیہ پڑھنے، قوم کی مصیبت پر ماتم کرنے پر کون سی مجلس بنائی ہے کہ ہم وہیں جا کر نوحہ کریں اور سر پیٹیں؟ ہم اگر مضر یا بے سود کام کرنے کے گنہ گار ہیں، تو قوم کو مرتے دیکھنے اور کچھ نہ کرنے کا ذمہ دار کون ہے۔

گر زہر تو کشتن و بُردن گناہِ من | دیدن ہلاک و رحم نہ کردن گناہ کیست
گیرم کہ وقتِ ذبح طپیدن گناہِ من | دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست"[1]

محمد سرور مرحوم (استاذ تاریخ، جامعہ ملیہ اسلامیہ) فرماتے ہیں:

---

[1] آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ صدارتی خطبات (۱۸۸۶ء۔۱۹۰۶ء) مرتبہ آغا حسین ہمدانی۔ قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، اسلام آباد۔ ۱۹۸۶ء، ص ۸۴۔۸۲

"سر سید ہماری قوم کی نئی زندگی کے خالق ہیں[1]، ان کے جانشینوں نے اپنے مرشد کے بتائے ہوئے رستے پر بڑے خلوص اور سرگرمی سے قوم کو چلایا۔ محسن الملک اور وقار الملک نے مدرستہ العلوم اور ایجوکیشنل کانفرنس کے ذریعے ہم میں زندگی کا احساس اور جمعیت اور مرکزیت کا شعور قوی کیا۔ ان بزرگوں کی کوششوں سے اسلامی ہند کے مردہ جسم میں تازہ خون زندگی دوڑا اور ملتِ اسلامیہ نے نیا جنم لیا۔"[2]

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام (آل انڈیا مسلم لیگ کی پیش رو):

سیاسی سطح پر مسلم لیگ کے قیام سے پہلے مسلمانانِ ہند بجا طور پر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ہی کو سب سے بڑا سیاسی پلیٹ فارم سمجھتے تھے۔ مسلمان زعما و اکابر اس کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں شامل ہوتے رہے اور اپنا عملی کردار بھی ادا کرتے رہے۔ بالفعل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے آل انڈیا کانگریس کے مقابلے میں اہم کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جب ہندی اردو[3] تنازع شروع ہوا تو ایجوکیشنل کانفرنس کے زعما نے مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ سیاسی جماعت بنانے پر غور و خوض شروع کر دیا تھا۔

1۔ "اگر سید احمد خاں مرحوم و مغفور مسلمانوں کو دوبارہ علمی ذوق اور جستجو سے آشنا نہ کرتے تو یہ ملک جس میں ہم آزادی کا سانس لے رہے ہیں اس کا قیام ناممکن ہوتا۔ نہ ہمارے پاس اقبال ہوتے نہ جناح۔ نہ ہمیں اپنے ماحول کا فہم ہوتا نہ ہم بدلتے ہوئے حالات میں اسلام کے تقاضوں کو سمجھ سکتے چہ جائیکہ اپنے ملی مفاد کا تحفظ کر سکیں۔ بالاکوٹ اور دہلی کی شکستوں کے بعد اگر کسی چیز نے ہماری گرتی ہوئی قوم کو سنبھالا تو وہ علی گڑھ کی تعلیمی تحریک تھی۔ علی گڑھ نہ ہوتا تو پاکستان بھی نہ ہوتا...... پاکستان کی بنیاد ایک تعلیمی تحریک پر ہے اور ایک تعلیمی تحریک ہی اسے قوت اور عظمت بخش سکتی ہے۔"
(ممتاز حسن، ڈاکٹر "مقالات ممتاز" مشمولہ "تعلیم: ایک ناگزیر فریضہ" ادارۂ یادگار غالب، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص ۲۸۰)

2۔ محمد سرور، پروفیسر۔ مقدمہ: "مضامین محمد علی" ۔مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۳۸ء، صفحہ ب

3۔ ہندوؤں کی جانب سے اردو کے خلاف یہ تحریک علمی و ادبی کے بجائے ایک سیاسی تحریک تھی جس کا مقصد وحید ہندوستان سے مسلم تہذیب کی تمام نشانیوں کو یکسر ختم کرنا تھا۔ مسلمانوں کی الہامی کتاب قرآن کریم کے ساتھ خود ہندو کانگریسی لیڈر مسٹر گاندھی کی دشمنی اس حد تک تھی کہ وہ کہتے تھے میں اردو بھاشا کا اس لیے مخالف ہوں کہ اس کے اکثر الفاظ قرآنی بھاشا میں ہیں۔

(باقی بر صفحہ آئندہ)

۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں مسلم ایجوکیشنل کا بیسواں سالانہ اجلاس نواب مشتاق حسین وقار الملک (۲۴ مارچ ۱۸۴۱ء — ۲۷ جنوری ۱۹۱۷ء) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ شرکائے کانفرنس میں بحث و مباحث کے بعد اجلاس کے مندوبین کی اس تجویز کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کے سیاسی حقوق کی حفاظت کے لیے ایک علاحدہ سیاسی جماعت ہونی ضروری ہے۔ لہٰذا اس اجلاس میں اتفاق رائے سے آل انڈیا مسلم لیگ قائم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام یعنی دسمبر ۱۸۸۵ء کے بعد سے مسلمانوں کی سیاسی جماعت کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ نواب وقار الملک نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اولین تاسیسی اجلاس میں اپنے صدارتی خطاب میں یوں اظہار فرمایا:

'آنرایبل نواب خواجہ سلیم اللہ خان بہادر اور دیگر حضرات! آج جس غرض سے کہ ہم لوگ یہاں جمع ہوئے ہیں، وہ کوئی نئی ضرورت نہیں ہے۔ ہندوستان میں جس وقت سے انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی ہے، اس وقت سے وہ ضرورت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ سر سید مرحوم و مغفور نے جن کی عاقبت اندیشی اور عاقلانہ پالیسی کے مسلمان ہمیشہ مشکور و ممنون ہیں۔ نیشنل کانگریس کے بڑھتے ہوئے اثر سے متاثر ہو کر نہایت زور کے ساتھ اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں کی بہتری اور حفاظت اسی میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو کانگریس میں شریک ہونے سے

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

تاہم علی گڑھ تحریک سے بقول ضیاءُ الدین اصلاحی، علم و ادب کا فروغ اور اردو زبان کی مفید خدمت انجام پائی۔ سر سید، نواب محسن الملک اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اردو زبان کے تحفظ و بقا کے لیے بھرپور کوششیں کیں۔ ۱۹۰۳ء میں اردو کی ترویج و ترقی اور حفاظت کے لیے 'انجمن ترقی اردو' کا قیام عمل میں آیا۔ یہ انجمن، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ہی کی ایک شاخ تھی، جو آگے چل کر خود ایک بار آور درخت بن گئی اور تاریخ و تہذیب اور مسلم زبان اور کلچر کے ارتقا میں اس انجمن نے اہم کردار ادا کیا۔ (حصول پاکستان، ص ۵۱ اور ششماہی الایام، کراچی، جنوری۔ جون ۲۰۱۴ء، ص ۲۹)۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف 'ہندی اُردو تنازع (ہندو مسلم سیاست کی روشنی میں)' شائع کردہ نیشنل بک فاؤنڈیشن دیکھی جا سکتی ہے۔

باز رکھیں[1]، اور یہ رائے اس قدر صائب تھی کہ گو جناب مرحوم آج ہم میں نہیں ہیں، لیکن مسلمانوں کی عام رائے اس وقت وہی ہے اور جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے، ہم کو اس بات کی ضرورت زیادہ محسوس ہوتی جاتی ہے کہ مسلمانوں کے پولیٹکل حقوق کی حفاظت میں بیش از بیش اہتمام کریں'۔[2]

پروفیسر احمد سعید نے اپنی کتاب ''انجمن اسلامیہ امرتسر'' میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے باب میں لکھا ہے کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم کا قیام اگرچہ خالصتاً تعلیمی مقاصد کے لیے عمل میں آیا تھا[3]، لیکن اسی پلیٹ فارم سے سرسید نے کانگریس کے خلاف تقاریر کیں اور اسی پلیٹ فارم سے مسلمانوں کی پہلی باقاعدہ سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ

---

1. 'مسلم لیگ اور کانگریس کے مابین شروع سے اب تک یہ اختلاف چلا آرہا تھا کہ کانگریس چاہتی تھی کہ پورے ہندوستان پر اس کا اقتدار ہو۔ وہ جس قسم کا قانون چاہے وضع کرے۔ تمام اقلیتیں اس کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔ مسلم لیگ چاہتی تھی کہ دستور حکومت ایسا ہو جس میں مسلمانوں کو اپنے کلچر، زبان، تہذیب وتمدن، مذہب وغیرہ جیسے اہم معاملات میں پوری آزادی ہو اور وہ حکومت میں شریک ہو کر اپنی ملت کے حقوق پورے کرا سکیں'۔ (بدایونی، عبدالحامد قادری، مولانا۔ ''خطبہ صدارت۔ پاکستان کانفرنس'' مورخہ ۳۰/ اگست ۱۹۴۱ء منعقدہ رائے کوٹ ضلع لودھیانہ، مطبوعہ نظامی پریس۔ بدایوں، ص ۲۳)
2. 'تاریخ آل انڈیا مسلم لیگ۔ سرسیدؒ سے قائداعظمؒ تک' مرتبہ آزاد بن حیدر، ص ۱۱۰۔
3. 'ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے بقول، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس دراصل کانگریس کا ردعمل تھی۔ سرسیدؒ احمد خان نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان، ہندوؤں کی طرح سے مغربی طرز سے اپنی زندگیوں کو ڈھال لیں اور برطانوی حکام کے تحت سیاست میں حصہ لیں، کیونکہ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی کی وجہ سے یہ امتیاز کرنا مشکل تھا کہ سیاست میں کس طرح سے حصہ لیں، لہٰذا بہتر یہی تھا کہ سیاست میں حصہ نہ لیا جائے۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے قومی تقاضوں کے تحت مغربی تعلیم کا انتظام کیا۔ بنگال سے لے کر سرحد اور پنجاب سے دکن تک کے مسلمانوں کو اپنی قومی اور اجتماعی تعلیم وترقی کا احساس ہو گیا اور اسی بیداری کے نتیجہ میں آگے چل کر ملکی سیاست اور تحریک آزادی میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا'۔ (ڈاکٹر محمد علی صدیقی کا انٹرویو بمقام ان کی رہائش گاہ A-592, Block-J, North Nazimabad, Karachi بروز جمعرات مورخہ ۱۱/ نومبر ۲۰۱۲ء از کہکشاں ناز بحوالہ ششماہی الایام، کراچی، جنوری۔ جون ۲۰۱۴ء، مشمولہ: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں سید الطاف علی بریلوی کی خدمات (۱۹۳۵ء تا ۱۹۵۰ء)۔

معرضِ وجود میں آئی۔ ہمارے عہد کے مستند دانشور خواجہ رضی حیدر کی رائے ہے کہ مسلمانوں میں عام بیداری پیدا کرنے میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس بہت مفید ثابت ہوئی۔[2]

مسلم لیگ کو بلاشبہ بہ حیثیت جماعت بلکہ تحریک، پاکستان بنانے کا منفرد اعزاز حاصل ہے، لیکن یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلم لیگ نے بالفعل آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بطن سے جنم لیا، تو پھر اس کے فعال کردار کا اعتراف کیوں نہ کیا جائے۔

وابستگانِ علی گڑھ کا مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کے ساتھ والہانہ تعلق خاطر

آج اگر مورخین اس حقیقت کے معترف نظر آتے ہیں کہ تحریک پاکستان کو عملاً دست و بازو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے طلبہ نے عطا کیے تو اس کا کامل ادراک اس وقت بھی علی گڑھ والوں کو بصمیم قلب و جاں تھا۔ اور وہ بالفعل اپنے خون جگر سے اس ملی تحریک کی آبیاری میں جتے رہتے تھے۔

آیئے رسالہ سہ ماہی علی گڑھ جلد ۲۲، شمارہ نمبر ۱، ۱۹۴۶ء کا ایک شذرہ ملاحظہ فرمایئے۔

"علی گڑھ ہندوستان میں مسلم قوم کا سرچشمۂ فکر و عمل اور ان کی ملی زندگی کا آئینہ ہے۔ اس چند مربع میل سرزمین میں دس کروڑ انسانوں کی روح اور قلب و ذہن کی پہنائیاں بند ہیں۔ یہیں پہنچ کر ہندوستان کے "مردِ بیمار" کو پہلی بار امید کی کرن نظر آئی اور "خونِ صد ہزار انجم" سے نمودِ سحر کے آثار پیدا ہوئے یہیں سے تعلیمی اور مابعد معاشری اصلاح کا دور شروع ہوا اور یہیں سے اور یہیں کی اصلاحات کے بطن سے ۱۹۰۶ء میں سیاست نے مسلم لیگ کی شکل میں جنم لیا۔ یہیں سے خلافت کی آواز اُٹھ کر پورے ہندوستان میں گونجی اور یہیں کے مجاہدوں نے اُس نازک وقت میں جناح کے گرد جمع ہو کر مسلم قوم کو بچا لیا، جب کانگریس اسے اپنے میں ضم کر لینا یا بالفاظ دیگر اس چراغ کو اپنے دامن میں چھپا کر گل کر دینا

---

[1] انجمن اسلامیہ امرتسر (۱۸۷۳ء۔۱۹۴۷ء) تعلیمی و سیاسی خدمات از احمد سعید، مطبوعہ ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۶۳۔

[2] قائداعظم کے ۲۷ سال، سورتی اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۷۔

چاہتی تھی۔ جہاں کی یہ تاریخ ہو وہاں یہ کس طرح ممکن تھا کہ قوم پر آزمائش کا وقت آپڑے اور خاموشی رہے۔ چناں چہ جب ہنگامہ انتخابات شروع ہوا اور قوم کو ضرورت ہوئی تو یہاں کے فرزند قوم کے مفاد پر اپنے مفاد، اور قوم کے مستقبل پر اپنے مستقبل کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ہزاروں اسرافیل لے کر اُٹھے اور موت کی سی نیند سونے والوں کو بھی جھنجوڑ جھنجوڑ کر اُٹھا دیا۔ قریوں قریوں پھرے اور گلیوں گلیوں کی خاک چھانی کہیں صرف اپنی جیب کے چنوں پر گذارا کیا اور کہیں کڑکڑاتی سرد راتیں اپنی سیاہ شیروانیوں کے سہارے کھلے میدانوں میں گذار دیں۔ مشکل سے ہندوستان کا کوئی ایسا مسلم آباد گوشہ ہوگا جہاں ان کے قدم نہ پہنچے ہوں اور موذن کی صداؤں سے آشنا کم ایسی بستیاں ہوں گی جہاں ان کی آواز نہ گونجی ہو۔ کہیں کہیں تیس تیس، چالیس چالیس میل کی مسافت بیک وقت پیادہ پا طے کی اور کہیں بیمار پڑے تو غربت و کس مپرسی میں بھی اپنے رفیقوں کو حکم کار دے کر رخصت کر دیا۔ بالآخر اس جذبۂ ایثار و خلوص عمل کو کامل فتح ہوئی اور دنیا کو معلوم ہو گیا کہ مسلم لیگ مسلم قوم کا پیکر اور پاکستان اس کی روح ہے۔“ [1]

علی گڑھ کا طلبہ محاذ قائداعظم کی نظر میں

علی گڑھ والوں کی تحریک پاکستان اور قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ محبت یک طرفہ یا محض وقتی جذبات کی آئینہ دار نہ تھی۔ نہ ہی یہ چاہت اور خلوص یک طرفہ تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح کو نوجوانانِ علی گڑھ کی محبت کا حد درجہ پاس تھا اور وہ اپنے ان جاں نثاروں کی دل جوئی اور سرپرستی کو اپنے اوپر لازم جانتے تھے۔ ذیل میں ان کے خیالات کی ترجمانی کرتی ایک تحریر دیکھیے۔

”علی گڑھ میری تحریک کا مرکز ہے، یہیں سے میرے نوجوان سفیر برِاعظم ہندوستان کے ہر کونے میں جا کر مسلمان عوام کو مسلم لیگ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ ان کا مشنری

---

[1] سہ ماہی علی گڑھ میگزین ۱۹۴۶ء۔ ادارتی شذرہ بعنوان: مادر درس گاہ، صفحہ ط اور ی۔

جذبہ اور تحریک سے بے لوث لگاؤ ہی میری ساری متاع ہے۔ میں علی گڑھ دس کام چھوڑ کر آتا ہوں اور ان بچوں کی صحبت میں بیٹھ کر اور ان سے باتیں کر کے اپنے عزم اور ارادے میں تقویت حاصل کرتا ہوں۔" [1]

تحریک پاکستان کے سنگ ہائے بنیاد میں ایک اہم ترین نام آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

پاکستان کے تخیل کو ایک زندہ حقیقت بنانے کے لیے جو جاں گسل اور پیہم جدوجہد ہمارے اکابر نے کی، اس سعی جمیل میں ایک اہم ترین کارنامہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا وجود میں لانا ہے۔ اس کتاب کے مختلف ابواب میں انتہائی شرح وبسط کے ساتھ اس ادارہ کی اہمیت و افادیت اور گراں قدر خدمات کا اظہار کیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں جہاں جہاں سے بھی کوئی قابل ذکر اور قابل قدر مواد میسر آیا اسے کتاب کا حصہ بنایا گیا کہ قارئین کرام زیادہ سے زیادہ تاریخی حقائق تک رسائی حاصل کر سکیں۔

حُسنِ اتفاق سے جناب افضل عثمانی کا ایک مفید اور مستند مقالہ ہمارے ہاتھ آیا، جو ہم من و عن بزبان انگریزی ہی شامل کتاب کر رہے ہیں۔

---

[1] ''علی گڑھ اور تحریک پاکستان'': نواب مشتاق احمد خاں، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، اگست ۱۹۶۹ء، بحوالہ کرامت علی خاں: ''جہاد آزادی (منتخب مقالات)'' طبع لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۲۔

All India Muslim Educational Conference
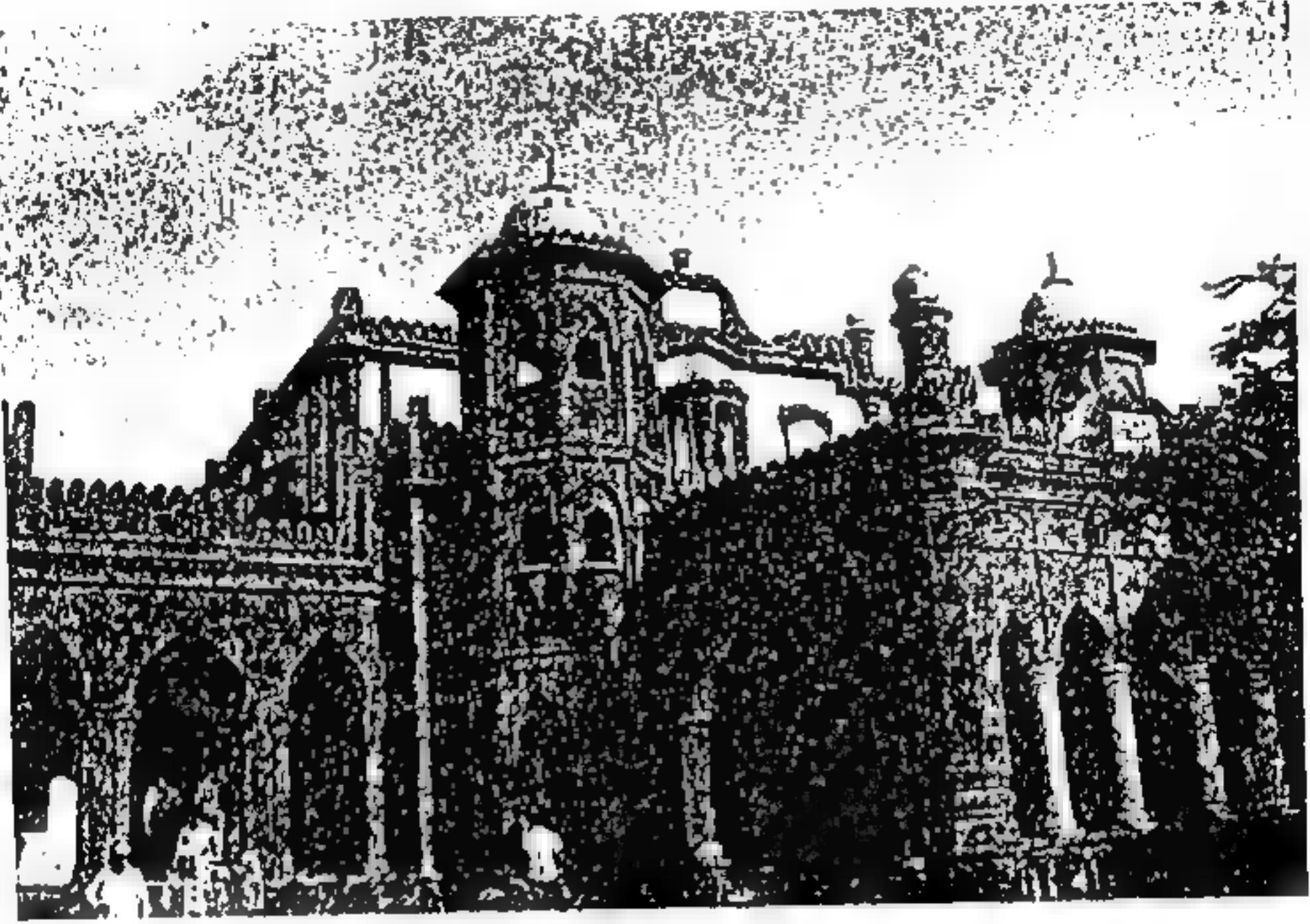
سلطان جہاں منزل (مرکزی دفتر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس) کا اندرونی منظر
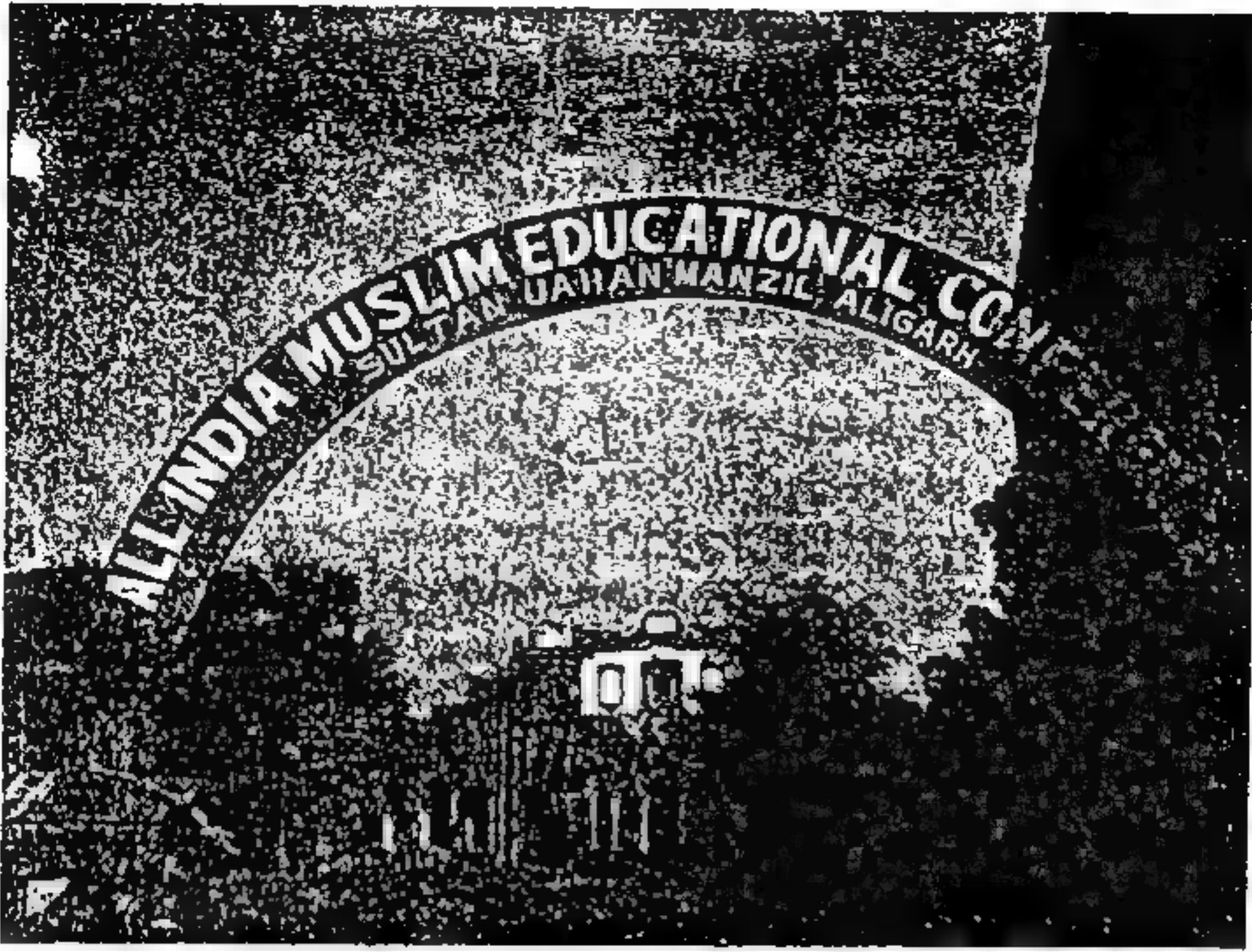
**All India Muslim Educational Conference Head Office
(Sultan Jahan Manzil, AMU Aligarh India)**

By Afzal Usmani

All India Muslim Educational Conference (AIMEC), a Non-political organization which brought Muslim rulers of remaining princely states of undivided British India, social and political leaders, intellectuals and distinguished people from all of walks of life onto one platform for educational empowerment of Muslims of India and transformed the dimensions of Aligarh Movement and fulfilled the dream of its founder, Sir Syed Ahmad Khan by converting Muhammadan Anglo Oriental College (M.A.O. College) to Aligarh Muslim University. The Conference also became championing the cause of Women's education and gave birth to one of the oldest and biggest women's educational institution, Women's College of Aligarh. This non-political, All India Muslim Educational Conference which was started for educational empowerment of Muslims of India also gave birth to largest Muslim political party "Muslim League" which still has roots in all the 3 countries of British India, Pakistan, Bangladesh and India. This one time conglomerate of Muslim Intelligentsia of British India has lost its glory and living or dying quietly in a monumental and historical building

"Sulatn Jahan Manzil" in Aligarh Muslim University campus. The only time we hear its name when it sends 5 representatives to Aligarh Muslim University supreme governing instituti■ AMU Court or get ■ peek into its symbolic lowest possible subscribed Journal, "Conference Gazette". Let's have ■ look, what was All India Muslim Educational Conference.

The inauguration of first Session of Indian national Congr■ at Bombay on 28-31 December 1885 by Allan Octavian Hume was ■ turning point in social and political movements of British India. Indian National Congress chooses ■ path of confrontational politics with the rulers of British India which was against the philosophy of Sir Syed Ahmad Khan, who was ■ strong supporter of Co operational Politics with British Empire. This lead Sir Syed to establish Mohammadan Educational Congress on 27th December, 1886 at Aligarh. By this time Sir Syed was undisputed well wisher of Muslims of India and had unquestioned secular credentials. Sir Syed's decision not to participate in Indian National Congress surprised ■ lot of intellectuals of the time. But Sir Syed was very clear in his mission of Muslim upliftment and at any cost he did not wanted to see the wrath of British Empire on Muslims of India which he had himself witnessed after 1857 revolt and so he choose the path of Co operational Politics with the rulers of India. This Congress became Mohammadan Educational Conference in the annual session of 1890 at Allahabad. This organization was a key element of Aligarh Movement and played an important role in taking the Aligarh Movement across the Indian Sub-continent and the establishment of Aligarh Muslim University. It is ■ established fact that the foundation of AIMEC was to keep Muslims of India away from ■ confrontational politics of Indian National Congress against British Empire and to do so it was made very clear that AIMEC is socio-political group to promote education among the Muslims of Indian subcontinent. One of the demands of the INC was to have open competition for Civil Services. Sir Syed was convinced that Muslims of India are educationally not at par with their fellow countrymen and so can not compete in open competition with their fellow countrymen. Sir Syed and leaders of AIMEC made it very clear that AIMEC is neither against INC or other political groups of India nor intended to alienate Indian Muslims from main stream political process but to promote education among the Muslims of Indian subcontinent to bring them at par with their fellow countrymen. In the Inaugural session of Muslim Educational Conference on 27th December, 1886 at Aligarh, Sir Syed emphasized his philosophy of co operational politics with the rulers of India and put forward the need of educational

empowerment for the Muslims of India. Indian National Congress leaders were not very happy with the formation of Muslim Educational Conference.

Muslim Educational Conference was concern primarily with Muslim education. It kept a vigilant eye on the spread of modern education among Muslims and passed resolutions and took steps to deal with the factors which were hindering its progress. Muslim Educational Conference became a platform for Indian Muslim Intelligentsia to mobilize Indian Muslim masses to promote education and specifically modern and western education and clear their doubts and misconception about the western and modern education. The Conference was much more than a gathering of Muslim Educationist and gave an opportunity to Aligarh Movement leaders to promote Aligarh Movement. Principal Theodore Beck and Prof. Theodore Morrison also took keen interest in Conferences activities. Sir Syed Ahmad Khan was elected as Secretary of the newly formed organization. The Conference was a powerful instrument of Intellectual awakening and general spread of knowledge amongst the Muslims of India.

The life of All India Muslim Educational Conference can be broadly divided in five phases or periods;

1. 1886-1898 : Sir Syed Period
2. 1898-1907 : Mohsinul Mulk Period
3. 1907-1917 : Sahabzadah Aftab Ahmad Khan Period
4. 1917-1947 : Nawab Sadar Yar Jang Period
5. 1947-till date : Post Independence period

1886-1898: Sir Syed Period:
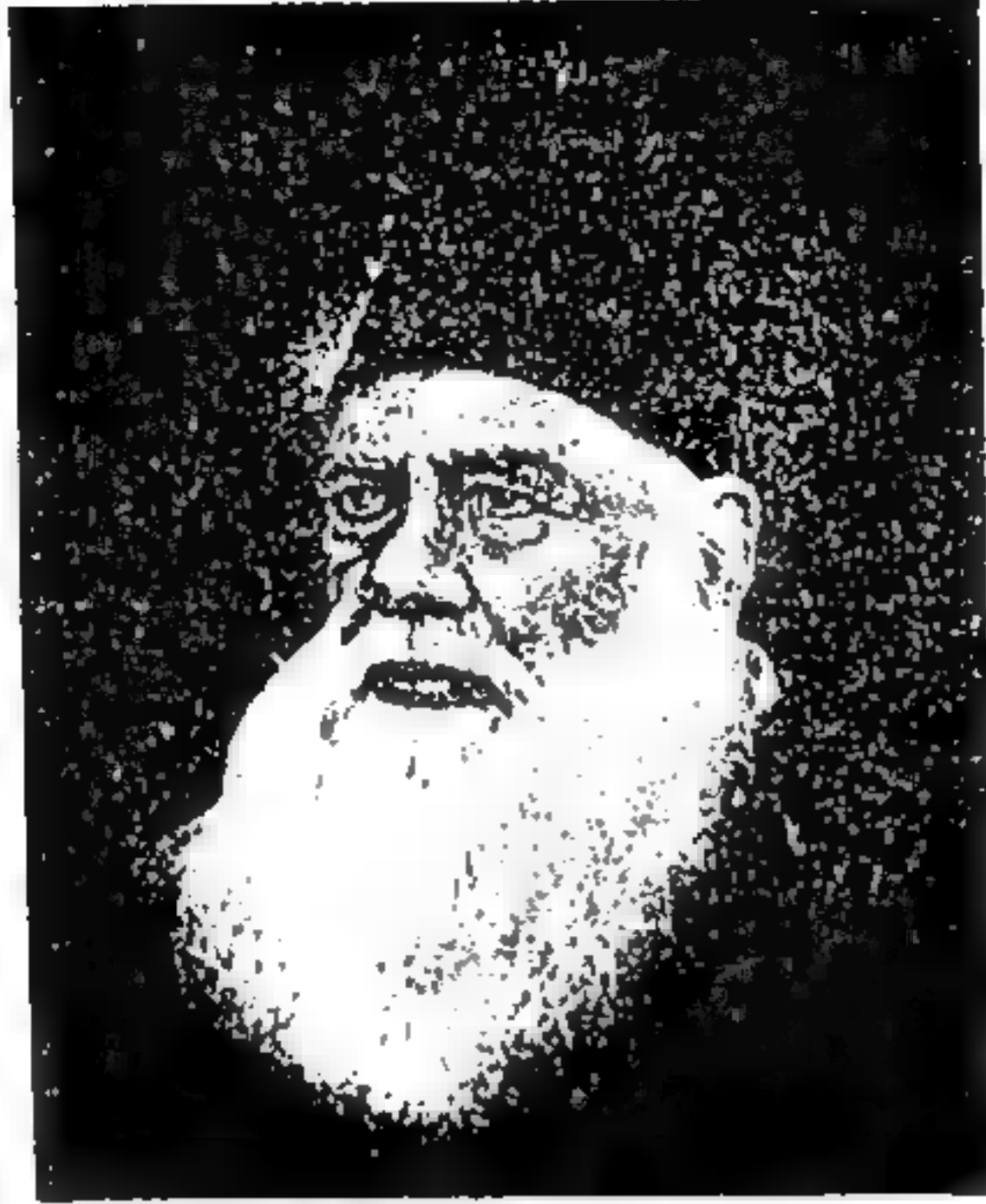
The Beginning ■ new Conglomerate of Muslims of India:

The first session of Muslim Educational Conference (AIMEC) was held at Aligarh. This inaugural session was presided over by none other than close friend of Sir Syed and one of the strongest supporters of Aligarh Movement, Maulvi Samiullah Khan. In this session, Sir Syed Ahmad Khan was elected as Secretary of the newly formed organization. The Inaugural session at Aligarh adopted the following resolutions;

1. Establishment of "AIMEC" and to hold its annual session in different parts of the country.P
2. British Government should only take care of modern and western education. Muslims will take care of Oriental studies.
3. Promote publications of journals and special attention should be paid for memorization of Quran (Hifz-e-Quran)
4. The Head Office of Muslim Educational Congress will be at Aligarh.

The second session of The Congress held at Lucknow and was presided over by Mr. Imtiyaz Ali Khan of Kakori. The session adopted the following resolutions;

1. Scholarships will be awarded to Muslim students for higher education.
2. Local Educational Committees were formed.

The first two sessions of The Congress were focusing on education but the Third session which was held at Lahore in 1888 focused on social issues of Muslims of India. The session was presided by Sardar Muhammad Hayat Khan and the following resolutions were adopted;

1. Voice was raised against some heinous and Non-Islamic traditions among the Muslims and solutions were
discussed to curb these Non-Islamic and heinous traditions from the Muslim societies.
2. Request was made to the government for concessions and exemptions on tuition fees for poor Muslim students.
3. Oriental and religious education should be started in Government Schools.
4. An extra effort needs to put for promotion of women's education.

The Fourth session was held at Aligarh in 1889 and was presided over by Sardar Muhammad Hayat Khan and following points were discussed;

1. A passionate appeal was made to donate Zakat Money for the education of poor Muslim students.
2. Demands were made to remove derogatory and anti-Islamic contents from History course books.
3. Proposals were made to establish separate technical institutes.
4. Special attentions were paid towards the need to develop curriculum for toddlers and kids.

The Fifth session was held at Allahabad in 1890 and once again it was presided by Sardar Muhammad Hayat Khan. The major attraction of this session was the renaming of All India Mohammadn Educational Congress to All India Muslim Educational Conference. The other focus of this session was translation of literary works of different languages into Indian languages. The marching mode of this caravan of Muslim intellectuals of India was well received by the Indian Muslims and its resolutions and

proposals started showing some results. The Sixth session at Aligarh recognized appreciated the efforts of Shamsul Ulema, Allama Shibli Nomani for his writings "Al-Jizya (Security Tax for Non-Muslims in Islamic State), Al-Mamoon (Biography of Khalifa Mamoon Al-Rasheed) and Seeratun-Noman (Biography of Imam-e-Azam, Abu Hanifa) ". This session also recognized the need of women education for the overall development of Muslims of India. Some concrete steps were proposed to promote women education. Publication of "Conference Journal "was ■ baby of this Aligarh session. This historical session at Aligarh was presided over by Nawab Ishaq Khan, who later served ■ Secretary of Mohammadan Anglo Oriental College Management. The Sixth session was held at Delhi in 1892 and faced some stiff resistance from some local theologians. This session was presided over by Maulvi Hashmatullah Khan. This session was also addressed by M.A.O. College Principal, Prof. Theodore Beck and M.A.O. College Professor and well known Orientlist, Prof. Thomas Walker Arnold. The session of 1894 at Aligarh also made ■ passionate appeal to support the newly formed organization "Nadwatul Ulema".

In 1896, the annual last executive session of Muslim Educational Conference in Sir Syed Ahmad Khan's lifetime, made ■ proposal to start a women education section in Muslim Educational Conference was accepted and Justice Karamat Hussain was appointed as its Founding Secretary. Nawab Mohsinul Mulk, Sahabzada Aftab Ahmad Khan, Janab Sultan Ahmad and Haji Ismail Khan were asked to assist Justice Karamat Hussain. In the annual session of Muslim Educational Conference of 1898 in Lahore, a separate department of women's education was established and Sahabzada Aftab Ahmad Khan was elected its Secretary. This started ■ wrath from the traditional Muslims of India but a dedicated team of Janab Ummid Ali, Ghulam-us-Saqlain and Haji Ismail Khan wrote several letters and article in Aligarh Institute Gazette and other reputed journals to defend the decision of Muslim Educational Conference to start a women's educational movement. Justice Amir Ali presided over the annual session of AIMEC in 1899 at Calcutta and the idea to start girl's schools is all of the state capital was accepted. It was also agreed that the Ulema will be consulted to develop the curriculum of the schools and the modern subjects of Science and Social Science will also be included the syllabus. In the session of December 1902 in Delhi under the leadership of H.H. Sir Agha Khan, young Shaikh Abdullah was appointed ■ Secretary to look into the women's educational project and was asked to start the activities very aggressively. The year 1897 was ■ bit tough on AIMEC as could not held the annual session due to poor

health complication with Sir Syed Ahmd Khan and finally Sir Syed Ahmad Khan died on 27th March 1898 and the rein of All India Muslim Educational Conference were transferred to Saiyad Mehdi Ali, Nawab Mohsinul-Mulk. By this time AIMEC had became an effective and established platform and even the opponents of Sir Syed including Justice Amir Ali, Justice Badruddin Tayabji and many more had joined the AIMEC and had started attending AIMEC sessions in different parts of the Country. The Brirish staff of MAO College including Principal Theodore beck, Prof. T. Morrison, Prof. T.W. Arnold and others started supporting the AIMEC in India and started ■ campaign to generate support in England too.

1898-1907: Mohsinul Mulk Period:

The Beginning of Movement for a Muslim University and Birth of Muslim League:

The death of Sir Syed was a tragic event for Aligarh Movement and its leaders but to fulfill the mission of Sir Syed, his close confident and friend and one of the strongest supporter of Aligarh Movement, Saiyad Mehdi Ali, Nawab Mohsinul Mulk was "elected as Secretary of M.A.O. College Management Committee as well ■ Honorary Secretary of All India Muslim Educational Conference. Colleges everywhere were feeling the pinch of the government's demands for higher fees and harder examinations. At Aligarh, the number of students fell from 595 in 1895 to 323 at the time of Sir Syed's death on 27 March 1898, and by the following July had plummeted to 189; and the situation was made worse by ■ embezzlement scandal in 1895, and by renewed attacks from Sir Syed's old collaborators who had broken with the college in 1889. The college accounts were in disorder, and ■ ■ result of embezzlement, the suspension of grants from ■ number of benefactors, and the fall in income from fees, the institution was heavily in debt. [6].

This was a very tough time for MAO College and Aligarh Movement but after taking over the rein of Aligarh Movement, Nawab Mohsinul Mulk gave a big boost to fulfill the dream of Sir Syed Ahmad Khan to convert M.A.O. College into a Muslim University and in the first session during his Secretary ship in 1898 at Lahore, he pushed forward the proposal of Muslim University. The proposal was prepared by Prof. T. Morrison and Maulvi Badrul Hasan. This session of AIMEC also put emphasis ■ moral education for youth and special attention were paid to promote women's education

The following proposals were made in the 12th session of AIMEC at Lahore, which was first session after the death of Sir Syed Ahmad Khan.
1. Proposal for a Muslim University.
2. Promotion of Women's Education.
3. Promotion of moral education for youths
4. Establishment of Muslim Hostels at Public or Private Institutions.

This session at Lahore was presided over by Nawab Fateh Ali Khan Qazalbash. The proposals for a Muslim university were fully discussed at this session at Lahore in December 1898. About 900 people attended and the Conference showed a new spirit of enterprise. Prof. T. Morison proposed that a Muslim university should be founded, observing that it would really be no more than an expanded version of Aligarh College. Beck reminded the audience that the University would be the Indian Muslims' passport to office. Badruddin Tyabji of Bombay, Sir Syed's old political antagonist, subscribed Rs. 2,000 to the university, and, from Calcutta, Syed Amir Ali pledged his support. In December 1899, the conference moved out of upper India and met in Calcutta under the presidency of Amir Ali. The Sir Syed memorial fund started a Bengal branch. The 1901 session of the conference took place in Madras. The following year, the Aga Khan presided over the meeting in Delhi, and in 1903 the Conference was held in Bombay under Badruddin Tyabji. Badruddin Tyabji, speaking as president of the 1903 Muhammadan Educational Conference, described the plans for a university as premature. Muslims should first lay a strong foundation of local Muslim schools and colleges which, initially at least, could be affiliated to the existing government universities.49 Akbar Hydari, Tyabji's nephew, spoke out against the whole idea of a Muslim university.50 Hydari argued that for secular advancement Muslims would be better off at the existing universities. Serious theological training was adequately provided in existing madrasas. Moreover, it would be foolhardy to bring the doctrines of different Muslim sects into open rivalry at one centre. At a regional meeting of the Educational Conference in Ahmadabad in October 1904, Muhammad Ali, younger brother of Shaukat Ali, replied to Hydari in an eloquent restatement of the Beck-Morison concept of a Muslim university.52 He called upon his experience at Aligarh and Oxford to argue for 'the expansion of Aligarh'. Muhammad Ali projected a bold view of India as a 'federation of religions'; only if Muslims and Hindus were allowed to cultivate their distinctive cultural traditions could they live together amicably. Therefore both the Muslim university at Aligarh and the Hindu university at Benares, proposed earlier in the year by Pandit Madan Mohan Malaviya, should be encouraged.

Professing 'no concern with politics, and certainly no desire to confound it with education', Muhammad Ali none the less warned that government educational policy must respond to the wishes of the people. The idea of a Muslim university had been generated by [illegible] popular movement: 'Aligarh is the people's very own.' Wider participation, however, also meant [illegible] greater variety of ideas about the university; if Aligarh [illegible] to ask for money from such far-off places, it had to offer something in return. To scores of meetings Mohsin ul-Mulk and others held out the image of Aligarh [illegible] the best hope of the Indian Muslims, the restorer of past greatness. The university was becoming a symbol of a reviving Islam. [6].

The other sessions were held at, Rampur (1900, Maulvi Syed Husain Bilgirami), Lucknow (1904- Prof. T. Morrison) and Aligarh (1905- Khalifa Mohd. Hussain). The major highlights of these different [illegible]ssions were promotion of Science, law and other modern education at M.A.O. College and promotion of Women's education and establishment of Girls School at Aligarh and establishment of Fund for M.A.O. College. MAO College affairs as well as AIMEC were demanding more time and resource and it became tough for Secretary of MAO College management Nawab Mohsinul Mulk to do a balance of commitment for MAO College and AIMEC, than a staunch supporter of Aligarh Movement Sahebzadah Aftab Ahmad Khan was appointed [illegible] founding Jt. Secretary of AIMEC in the annual session of 1905 at Aligarh.

Dhaka Session of 1906 and Birth of Muslim league:

Even though the official publication of All India Muslim Education Conference "Muslim Educational Conference kay 100 Saal " does not talk about the this session due to one or the other reasons but it is almost very clear that the 1906, Dhaka session of All India Muslim Educational Conference was the birth place for "All India Muslim League". In the early October 1906 All India Muslim Educational Conference leaders and few others met Viceroy of India at Shimla and discussed some of their concerns. Nawab Khwaja Salimullah of Dhaka could not join the deputation due to his cataract operation [2]. The omission of Division of Bengal issue from the discussion or unsatisfactory response from the Viceroy made young Nawab Khwaja Salimullah unhappy and he proposed an All India Muslim Educational Conference to be held in Dhaka, capital of the then East Bengal and Assam Province in the year 1906. The conference was inaugurated on 27

December 1906 and continued till 29 December 1906 ■ Conference on Education. The inaugural session ■ chaired by Nawab Justice Sharfuddin, the newly appointed justice of Calcutta High Court. On 30 December 1906 political session of the conference took place. It was chaired by Nawab Viqar-ul-Mulk. In this session a motion to form ■ All India Muslim League (AIML) was proceeded. Initially a party styled as All India Muslim Confederacy was discussed. But, in the process the name All India Muslim League, proposed by Nawab Khawaja Sir Salimullah Khan Bahadur and seconded by Hakim Ajmal Khan, was resolved in the meeting. All delegates were registered ■ members of the proposed party led by Janab Muhsin-ul-mulk and Janab Viqarul Mulk, who were Joint Conveners. AIML was first Muslim political party in the history of India. A total of 1955 delegates attended the event. The conference was attended by most of the Muslim zamindars, educationists, pleaders, and other leaders of the community.

1907-1917: Sahabzadah Aftab Ahmad Khan Period:

AIMEC and Muslim University Movement

Sahebzadah Aftab Ahmad Khan was officially Joint Secretary of All India Muslim Educational Conference and Secretary of M.A.O. College management Committee, Nawab Mohsinul Mulk, Nawab Viqarul Mulk and Nawab Ishaq Khan remained Secretary of AIMEC during this time of 1905-1917 but their pre-occupation with MAO College affairs gave young and energetic Aftab Ahmad Khan almost absolute freedom to give AIMEC ■ new direction. This 12 year reign of Sahebzadah Aftab Ahmad Khan gave AIMEC a new direction and took it to a new peak and AIMEC became ■ reckoning force of Muslims of India. It also took interest in local issues of the place where annual session is held and attentions were paid to help and support local community to over come their social and educational problems. He also expanded the perimeter of AIMEC and its annual session was held even in Rangoon in 1909. During this time the annual sessions were held at Karachi (1907- Altaf Hussain Hali), Amritsar (1908- Sir Khawaja Salimuddin of Dhaka), Rangoon (1909- Sir. H.H. Nawab Mohd. Ali, raja of Mahmudabad), Nagpur (1910- Abdullah Yusuf Ali, Principal of Islamia College of Lahore and famous English translator of Quran), Delhi (1911 – Emadul Mulk Syed Hussain Bilgirami), Lucknow (1912- Major Syed Hasan Bilgirami), Agra (1913- Justice Shah Deen), Rawalpindi (1914, Maulvi

Rahim Bakhsh), Pune (1915, Justice Abdul Rahim), Aligarh (1916- Miyan Mohd. Shafi), Calcutta (1917, Nawab Sir Haider Nawaz Jang Bahadur Mohd Akbar Ali).

The plan for the Muslim University had by 1910 taken on the complexion and force of a national movement. The session of the All India Muslim Educational Conference at Nagpur in December, 1910 was presided by Abdullah Ibn Yusuf Ali Khan. In his address Sir Aga Khan gave the signal for a concreted, nation-wide effort to raise the necessary funds for the projected University. In moving the resolution on the University, the Aga Khan III made a stirring speech. He said, "This is a unique occasion as His Majesty the King-Emperor is coming out to India. This is a great opportunity for us and such as is never to arise again during the lifetime of the present generation, and the Muslims should on no account miss it. We must make up and make serious, earnest and sincere efforts to carry into effect the one great essential movement which above all has a large claim on our energy and resources. If we show that we are able to help ourselves and that we are earnest in our endeavors and ready to make personal sacrifices, I have no doubt whatever that our sympathetic government, which only requires proper guarantees of our earnestness, will come forward to grant us the charter. 'Now or never' seems to be the inevitable situation." To make a concerted drive for the collection of funds, a Central Foundation Committee with the Sir Aga Khan III as Chairman with Maulana Shaukat Ali (1873- 1938) as his Secretary; and prominent Muslims from all walks of life as members was formed at Aligarh on January 10, 1911. The Aga Khan III accompanied by Maulana Shaukat Ali, who was still in government service and had taken a year's furlough, toured throughout the country to raise funds, visiting Calcutta, Allahabad, Lucknow, Kanpur, Lahore, Bombay and other places. Willi Frischauer in his book, The Aga Khans writes, "His campaign for the Aligarh University required a final big heave and, as Chairman of the fund raising committee, he went on a collecting tour through India's main Muslim areas: 'As a mendicant', he announced, 'I am now going out to beg from house to house and from street to street for the children of Indian Muslims.' It was a triumphal tour. Wherever he went, people unharnessed the horses of his carriage and pulled it themselves for miles"[4]. The response to the touching appeal of the Sir Aga Khan III was spontaneous. On his arrival at Lahore, the daily "Peace" of Punjab editorially commented and called upon the Muslims "to wake up, as the greatest personality and benefactor of Islam was in their city." The paper recalled a remark of Sir Syed Ahmad Khan prophesying the rise of a hand from the unseen world to accomplish his

mission. "That personality" the paper said, "was of the Sir Aga Khan III." On that day, the "London Times" commenting upon the visit, regarded him as a great recognized leader of Muslims. Allama Shibli Nomani was with Sir Aga Khan in the delegation for fund raiser to Lahore. Shibli recited a very passionate Persian poetry to motivate the audience for fund raiser. The significant aspect of the Aga Khan's fund collection drive was not the enthusiastic welcome accorded to him, but the house to house collection drive. Qayyum A. Malick writes in his book "Prince Aga Khan" that once the Aga Khan on his way to Bombay to collect funds for the university, the Aga Khan stopped his car at the office of a person, who was known to be his bitterest critic. The man stood up bewildered and asked, "Whom do you want Sir?" "I have come for your contribution to the Muslim university fund," said the Aga Khan. The man drew up a cheque for Rs. 5000/-. After pocketing the cheque, the Aga Khan took off his hat and said, "Now as a beggar, I beg from you something for the children of Islam. Put something in the bowl of this mendicant." The man wrote another cheque for Rs. 15000/- with moist eyes, and said, "Your Highness, now it is my turn to beg. I beg of you in the name of the most merciful God to forgive me for anything that I may have said against you. I never knew you were so great." The Aga Khan said, "Don't worry! It is my nature to forgive and forget in the cause of Islam and the Muslims." The drive received further great fillip from the announcement of a big donation of one lac rupees by Her Highness Nawab Sultan Jahan Begum of Bhopal. The Aga Khan III was so moved by her munificence that in thanking her, he spoke the following words:

Dil'e banda ra zinda kardi,
dil'e Islam ra zinda kardi,
dil'e qaum ra zinda kardi,
Khuda'i ta'ala ba tufail'e Rasul ajarash be dahad"

It means, "You put life in the heart of this servant; you put life in the heart of Islam; you put life in the heart of the nation. May God reward you for the sake of the Prophet!". In sum, Sir Aga Khan collected twenty-six lacs of rupees by July, 1912 in the drive and his personal contribution amounted to one lac rupees.

The Major resolutions and achievement of this period were;

1. AIMEC received a generous donation from ruler of Bhopal, Begum Sultan Jahan and built its head office building at Aligarh. The building is known as "Sultan Jahan Manzil" and even today it holds the office of AIMEC.
2. Movement for Muslim University was primary attention of AIMEC. A National Campaign was in full swing to raise money for Muslim University.
3. Foundation Committee was established under the Chairmanship of Sir Agha Khan.
4. Special attentions were paid to local social and educational issues.
5. Proposal for 1% educational tax to landlords from their agricultural produces.
6. Maharaja Kashmir was requested to pay attention to the educational issues of Kashmiri Muslims. A delegation was sent to Maharaja Kashmir to pursue him to pay attention to the educational issues of Muslims of Kashmir. Arabic Teachers were appointed in Schools of Kashmir
7. Schools at Aligarh will have a Kinder Garden (KG) educational system
8. Urdu should be a medium of Instruction in educational systems in Urdu speaking areas like Punjab.
9. Committee was formed to revise schools curriculum in Bengal
10. State Governments needs to grant some financial assistance to M.A.O. College and Schools.
11. A special fund was established to support the cost of Conferences for teachers and professors.
12. A sub-Committee was formed to help Burma's (Myanmar) educational development.
13. Special scholarship was instituted for meritorious students of Medical and Engineering Colleges.
14. Recommendations were made to have at least one Muslim Members in every state and University Text Book Committee.
15. Efforts were made to start a 'Yateem-Khana" in Burma
16. The need of a Islamia College in every state and secondary school for Muslims in every district was realized and efforts were made to have a Islamia College in every state and a Secondary school for muslims in every district.
17. Efforts were made to bring Islamic Scholars (Ulema) into AIMEC's fold and efforts were made to clear existing confusions from the minds of Ulema.
18. Muslim University Fund Committee was established to raise funds for Muslim University.
19. Muslim students were Encouraged to receive Medical education.
20. A state Educational Conference in Punjab was established.
21. Scholarships were instituted for technical educations for Muslim-

students.
22. A Movement was started to promote Madarsah of Calcutta to a Islamia College.
23. Protests were made when University of Calcutta dropped Arabic and Persian from their curriculum.

1917-1947: Nawab Sadar Yar Jang Period:

AIMEC under the umbrella of Aligarh Muslim University

In 1917, Sahabzadah Aftab Ahamd Khan was nominated into the British Council in the Ministry of Indian Affairs and he moved to England. AIMEC elected Maulana Habibur Rahman Khan Sherwani, Nawaba Sadar Yar Jang as its Joint Secretary. In 1920, when M.A.O. College became Aligarh Muslim University, at Amrawati, AIMEC made a constitutional amendment and AMU Vice-Chancellor became President of AIMEC and elected Maulana Habibur Rahman Khan Sherwani, Nawaba Sadar Yar Jang as Honorary Secretary and so he served to position till 1947. In his leadership, the first session was held in 1918 at Surat (Bombay State- now in Gujarat). The session was presided over by Sir Ibrahim Rahmatullah. The session appreciated the efforts of Bombay State Government for starting Urdu Medium Schools. A committee was formed under the leadership of Dr. Ziauddin Ahmad to promote a similar concept of Urdu Medium schools in other states. Fund was raised to establish a Muslim hostel in Surat. Proposal was adopted to start a Training College for the teachers of Arabic Schools/Madaris. The annual session of 1923 at Aligarh adopted the proposal to rename All India Mohammad Educational Conference to All India Muslim Educational Conference.

After the establishment of Aligarh Muslim University, the All India Muslim Educational Conference could not work with the same pace as it worked for the establishment of Aligarh Muslim University. At the same time division of Aligarh Movement leaders and establishment of a news University Jamia Millia Islamia took some of the resources of AIMEC. Even though the sessions of AIMEC used to held annually at Khairpur-Sindh (1919- Maulvi Rahim Bakhsh), Amrawati (1920 – H. Ibrahim Haroon Jaffer), Aligarh (1922- Miyan Fazal Hussain), Aligarh (1923- Sahabzadah Aftab Ahmad Khan), Bombay (1924-Ibrahim Rahmatullah), Aligarh (1925 – Sahabzadah Abdul Qayum), Delhi (1926- Abdul Rahim), Madras (1927 – Shaikh Abdul

Qadir), Ajmer (1928- Sir Shah Sulaiman), Banaras (1930 – Sir Ross Masood), Rohtak (1931 – Sir Syed Raza Ali), Lahore (1932 – Col. Maqbool Hussain Quraishi), Meerut (1934 – Sir Shaikh Abdul Qadir), Agra (1936- Sir Ziauddin Ahmad), Rampur (1936 – H.H. Sir Agha Khan) and the 50th anniversary session of AIMEC [illegible] held at Aligarh in 1937. In 1938, the annual session was held in Patna and Maulvi Fazal Haq presided over the session. The next sessions were held at Calcutta (1939–Nawab Kamal Yar Jang), Pune (1940, Maulvi Fazal Haq), Aligarh (1943 – Nawab Zaheer Yar Jang), Jabalpur (1944 – Sir Azizul Haq). The last session of All India Muslim Educational Conference in British India was held at Agra1945 and was presided over by Nawabzadah Liyaqat Ali Khan. These session were focusing on growth of Muslim University and other social and educational issues faced by Muslims of India. During the peak of freedom of India movement, AIMEC sessions were not very regular [illegible] the major [illegible]rgy of masses was used in freedom movement.

1947-till date: Post Independence period

On 14th &15th August 1947, British India became 2 independent countries India and Pakistan and due to Aligarh's geographical location, of course All India Muslim Educational Conference became an organization of India. An All Pakistan Educational Conference was formed in Pakistan by Mr. Syed Altaf Ali barelvi. The detail of All Pakistan Muslim Educational Conference can be found in "History of the Conference" by Mr. Syed Altaf Ali Barelvi. The subsequent few years were very tough for the Indian sub-continent and hence even at Aligarh, it took time to bring things in order. Dr. Zakir Hussain was appointed as first Vice-Chancellor of Aligarh Muslim University in independent India. The Ministry of Educational affairs started looking into affairs of Aligarh Muslim University.

Secretary : 1949 - 1992

In the mean time in 1949, AIMEC elected Alhaj Obaidur Rahman Khan Sherwani [illegible] its Honorary Secretary. Alhaj Obaidur Rahman Khan was [illegible] of Maulana Habibur Rahman Khan Shrw[illegible]i. This started a new chapter in the history of AIMEC. After his election [illegible] Honorary Secretary, the first session was held in 1952 at Aligarh. The session was chaired by AIMEC President and Vice-Chancellor of AMU Aligarh. After the Aligarh session, the last regular session of AIMEC was held in 1955 in Madras (Chennai) under the

leadership of Dr. Zakir Hussain. After 1955 session, no session of AIMEC held. After a gap of 38 years, ■ session of AIMEC was held in 1993 in Delhi under the Chairmanship of Prof. Rasheeduz Zafar, the then Vice-Chancellor of Jamia Hamdard. This ■ the last known AIMEC function.

As per Dr. Mohsin Raza, former president of AMU Students Union and a faculty at Jawaharlal Nehru Medical College at AMU Aligarh, ■ session of AIMEC was also held in 1969 at Aligarh. This session was presided over by Mr. Badruddin Tayyabji, the then Vice-Chancellor of AMU and president of AIMEC. Here is the narration of Dr. Mohsin Raza on 1969 session of AIMEC;

"One session that I attended was held in 1969, Late Badruddin Tayyabji attended this session. Several members assailed the inactivity of the AIMEC ,Maulana Saeedurrehman Zaini was extra loud on which Mr. Badruddin Tayyabji took an exception and got angry". In the same meeting the Sultan Jahan Manzil Hall was officially allotted without rent to the Muslim Social Uplift Society's Medical Coaching Centre."

The official publications of AIMEC do not have any account of this session of 1969.

Till 1972, Vice-Chancellor of Aligarh Muslim University used to be President of AIMEC. In 1972, AIMEC made an amendment in its constitution and elected Industrialist Mr. Mustafa Rasheed Sherwani, Founder & Chairman of Jeep Flashlight. This marked a new start in AIMEC and now AMU doe not have any association with AIMEC. In the meantime Kr. Ammar Ahmad Khan was elected as Honorary Secretary in 1958 and served till 1964, and then Prof. Anwarul Haq Haqqi was Honorary Secretary from 1964 to 1970. Once again Alhaj Obaidur Rahman Khan Sherwani got elected as Honorary Secretary and he served till his last breath in 1992 and then his son Prof. Reyazur Rahman Khan Sherwani got elected ■ Secretary of AIMEC and Mr. Amanullah Khan Sherwani ■ Joint Secretary and they are serving till date. AIMEC elected Kr. Ammar Ahmad ■ its President in 1992 and had served till his last breath in 2004. After his sad demise, no news about any President of AIMEC. As ■ principal organ of Aligarh Movement, AIMEC found 5 permanent births ■ AMU Court. Here is the list of MEC representative in AMU Court in the last session; Mr. Asad Yar Khan, New Delhi, Mr. Kh. Mohd. Shahid, New Delhi, Mr.

Munawwar Haziq, New Delhi, Dr. Shahid Qamar Qazi, Aligarh and Prof. Akhtarul Wasey, New Delhi.

All India Muslim Education Conference had played a key role in the establishment of Aligarh Muslim University and had always supported AMU for its progress. Even after 1920, when Aligarh Muslim University was created, AIMEC generated funds to start different courses at AMU and helped in promoting the cause of Aligarh Movement. But for one or the other reasons, AIMEC stopped playing its role in independent India. The geo political situation of Independent India is totally different than British India but this does not prevent to work for the upliftment of social and educational problems of Muslims of India. Different Muslim Social and Educational organizations got started in independent India and flourished in their respective mission like Anjuman Islam and Anjuman Khairul Islam in Maharashtra, Al-Amin in Karnataka and many more in different parts of the country and they had established schools and colleges in their respective area of operation whereas AIMEC became extinct.

To know more about Muslim Education Conference, please refer to;

1. Muslim Educational Conference kay 100 Saal By Amanullah Khan Shrwani
2. Education of Indian Muslims: a study of the All-India Muslim Educational By Akhtarul Wasey, All-India Muslim Educational Conference
3. "Separatism among Indian Muslims" by Francis Robinson,
4. The All India Muslim educational conference: its contributions By Abdul Rashid Khan
5. The Muslims of British India By Peter Hardy
6. Campaign for Muslim University- David Leylyveld & Gail Minault

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اثرات

سید احمد خان کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کو ماضی کے بند خول سے باہر نکالنے اور جدید تعلیم سے بہرہ ور کرنے کی بھرپور جدوجہد کی نتیجتاً وہ معاشی ترقی کے راستے پر گامزن ہو گئے۔ کانفرنس نے ابتدائی بیس (۲۰) سالوں (یعنی اپنے قیام سے ۱۹۰۶ء تک) میں نہ صرف اپنی بنیادیں مضبوط کیں، بل کہ برِعظیم میں مسلمانوں کی تمدنی زندگی کے مختلف تعلیمی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی شعبوں میں دُور رس اثرات مرتب کیے اور اس طرح ہماری ملّی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا، جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

تعلیمی اثرات:

یہ کانفرنس سید احمد خان کے تصورِ تعلیم کا نتیجہ تھی۔ آپ کی بے لوث اور مثالی کاوشوں کے ثمرات یوں مرتب ہوئے:

- کانفرنس نے مسلمانوں کو چار دانگ ہند میں تعلیم کی طرف راغب کیا۔
- قوم کے ہونہار بچوں کے لیے وظائف کا انتظام کیا، قومی تعلیم گاہیں قائم کیں، تعلیمی مصارف کی بہم رسانی کی سبیلیں نکالیں۔
- مسلمانوں کو تعلیمِ نسواں، مدارسِ شبینہ، صنعت و حرفت، اسلامی علوم و فنون، تجارت و زراعت اور دیگر پیشوں کی تعلیم و تربیت جسمانی کی جانب توجہ دلائی۔
- حکومت کو مسلمانوں کے ہر قسم کے جائز تعلیمی حقوق و ضروریات کی جانب متوجہ کیا یہاں تک کہ بعض دیسی ریاستوں کے دروازوں پر بھی دستک دی۔
- کانفرنس کی تحریک سے اردو لٹریچر میں معقول اور قابلِ قدر اضافہ ہوا۔
- مسلمانوں کی علم و فن میں دل چسپی بڑھنے سے ان میں حکمت اور دانائی کی اقدار کو راسخ کر دیا۔
- کانفرنس کے خطبات، تقاریر اور قراردادیں آج بھی مسلمانوں کی ترقی کے لیے منارِ نور ہیں۔

معاشی اثرات:

۱۸۵۷ء کے سانحہ نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم اور انگریزی ملازمت سے متنفر کر دیا تھا، لیکن اب صورت حال بدلی:

- سر سید احمد خاں کی تحریک علی گڑھ نے جب مسلمانوں کے قلوب و افکار، علم و فن کی روشن خیالی اور وسعت کو اجاگر کیا، تو ان کے لیے ملازمتوں کے حصول کے لیے آسانیاں پیدا ہو گئیں۔
- یہاں کے فارغ التحصیل نوجوانوں نے سرکاری و نیم سرکاری ملازمتوں میں شمولیت اختیار کر کے حتی المقدور مسلمانوں کی ترقی کے سامان پیدا کیے۔ قوم کے یہ سپوت سر سید احمد کے خوابوں کی تعبیر ثابت ہوئے۔
- مسلمانوں نے کانفرنس کی جدوجہد سے صنعت و حرفت، زراعت، تجارت، وکالت وغیرہ میں کافی ترقی کی۔
- مسلمانوں کی معاشی بدحالی ختم ہونے سے وہ اس قابل ہوئے کہ برعظیم کی دوسری اقوام خاص کر ہندوؤں کے مدِ مقابل نیا مقام پیدا کر لیا۔

معاشرتی اثرات:

حصولِ تعلیم کے شوق اور مسلمانوں کی معاشی حالت کی بہتری نے اُن کی معاشرتی زندگی میں بھی انقلاب برپا کر دیا:

- منزل اور حصولِ منزل کی جدوجہد سے اتحاد و یگانگت کا درس ملا۔
- مسلمانوں کی ایک معتدبہ جماعت کو قومی تعصبات کی بیڑی اور ملکی رسم و رواج (جو ان میں ہمسایہ قوم سے تمدنی میل جول کے باعث در آئے تھے) کی غلامی سے بالکل آزاد کر دیا۔
- سر سید احمد خاں کے مشن کو کانفرنس نے ان کی رحلت کے بعد نہ صرف آگے بڑھایا، بل کہ

---

[1] ''سر سید احمد خاں کے جانشینوں میں بھی چند ایسے لوگ تھے جن کے دل و دماغ ملکی اور ملی جذبے سے سرشار تھے۔ وہ اپنے مقصد کے پیشِ نظر کام کی لگن کا جذبہ بدرجۂ اتم رکھتے تھے۔ پھر نہ وہ رات کو رات سمجھتے تھے اور نہ دن کو دن۔ انھیں لوگوں میں نواب محسن الملک۔ نواب وقار الملک۔ قابلِ ذکر ہیں''۔ (عثمانی، امیر احمد، پروفیسر حکیم۔ مشمولہ، مضمون: ''میڈیکل کالج مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اور ڈاکٹر ہادی حسن''۔ کراچی، العلم سہ ماہی جنوری تا مارچ و اپریل تا جون ۱۹۸۸ء، جلد نمبر ۳۶ شمارہ نمبر ۱ و ۲، ص ۸۱)۔

ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں انقلاب آفریں کردار ادا کیا۔

سیاسی اثرات:

مسلمانوں میں شعور اجاگر ہونے پر انھوں نے ملت کی بقاوترقی کے لیے تدابیر بھی سوچیں:

- معاشرے میں بیداری کے باعث مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی بحالی اور حصول کے لیے کوششیں عمل میں آئیں۔
- کانفرنس نے مسلمانوں میں قومی واجتماعی تعلیم وترقی کے احساس کو مہمیز لگائی جس سے آگے چل کر ملکی سیاست اور تحریکِ آزادی میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔
- آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی توجہ اور کوشش سے مسلم لیگ معرضِ وجود میں آئی، جس کے جھنڈے تلے برِعظیم کے مسلمان جمع ہوئے اور یوں آزادی کا قافلہ اپنی منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں ہوا۔
- اسی تنظیم نے سرسید احمد کے دوقومی نظریے کو اپنے منشور کی بنیاد بنا کر نہ صرف مسلم قومیت کو اجاگر کیا، بل کہ مسلمانوں کی آزادی کی جنگ لڑی اور تمام تر دشواریوں کے باوجود مسلمانوں نے متحد ہو کر قائداعظم کی قیادت اور بے مثال رہنمائی میں ۱۹۴۷ء میں مملکتِ پاکستان حاصل کی۔
- تحریک علی گڑھ[1] سے قیام مسلم لیگ تک کی تاریخ، مسلم تحریکِ آزادی کا ایک اہم باب ہے، جس پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدارتی خطبات (۱۸۸۶ـ۱۹۰۶ء) شاہد عادل ہیں۔

---

[1] ''یوں تو تحریکِ پاکستان تقریباً ایک صدی سے چل رہی تھی۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کا قیام ایک چھوٹے سے پاکستان کا سنگ بنیاد تھا۔'' (زاہدی، سید مسعود۔ مضمون ''قائداعظم! ہم شرمندہ ہیں!''، ہفت روزہ استقلال، لاہور، ۱۲ رتا ۱۸ رجنوری ۱۹۸۳ء، ص ۱۹)۔ نیز بقول یاسمین خان، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی جو دہلی سے چند گھنٹوں کی مسافت پر واقع ہے، اسے قیام پاکستان کی نظریاتی جنگ کے مرکزی حیثیت بھی حاصل تھی۔ (عظیم بٹوارا۔ پاکستان اور ہندوستان کا قیام)

▪ بیسویں صدی کے آغاز میں کانفرنس کی اگلی صف میں شریک مسلم زعما مسلم سیاست میں بھی پیش پیش تھے۔ بقول محترمہ ممتاز معین[1]، یہ کانفرنس مسلم لیگ کے قیام (۱۹۰۶ء) تک ہندوستان میں مسلمانوں کے مفادات کی نگہداشت کرتی رہی۔
الغرض ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام اسی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا توسیعی عمل تھا۔

ظہور الدین خاں امرتسری

---

1. مسز ممتاز معین ایم اے، سابقہ پرنسپل اسلامیہ کالج۔ کراچی، مصنفہ دی علی گڑھ موومنٹ۔

پروفیسر سلیمان اشرف اکابرین ملت کی نظر میں

مولانا سلیمان اشرف صاحب کی تقریر، جو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے نشر ہوئی۔ بعد میں 'الخطاب' کے عنوان سے ۱۹۱۵ء میں انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں چھپ کر شائع ہوئی۔

مولانا سید سلیمان اشرف کو اللہ تعالیٰ نے جہاں گوناگوں کمالات اور خوبیوں سے نوازا تھا وہاں ان کو تقریر و خطابت کا بھی بڑا ملکہ عطا کیا تھا، ان کی ہر تقریر کی طرح یہ تقریر بھی نہایت موثر، ولولہ انگیز اور از دل خیزد بر دل ریزد کا مصداق تھی۔ دیکھیے مولانا کا یہ خطاب جہاں بہت سی مفید معلومات لیے ہوئے ہے وہیں اسلامی علوم و فنون کی اجمالی تاریخ بھی سامنے آجاتی ہے۔ نیز ان کی تصانیف آج بھی ایک زندہ رہنما کی طرح ہیں۔

ماننا پڑتا ہے کہ مولانا سلیمان اشرف تقریر و تحریر میں 'علمہ البیان' کی نعمتِ عظمٰی سے سرفراز تھے۔ بقول آل احمد سرور، مولانا کی شخصیت میں علم کی رئیسانہ شان ہے۔ ان کی عظمتوں کے علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد، خواجہ حسن نظامی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی[1] اور نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی جیسے اہلِ علم معترف رہے ہیں۔ ممتاز ادیب اور تذکرہ نگار طالب ہاشمی (۱۹۲۹ء۔ ۱۸ر فروری ۲۰۰۸ء) رقمطراز ہیں۔

> "حضرت مولانا سید محمد سلیمان اشرف کا شمار اپنے دور کے سرآمد روزگار علما میں ہوتا تھا۔ وہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ اسلامیات کے صدر تھے اور قریب قریب ساری عمر انھوں نے علی گڑھ ہی میں گزار دی۔ ان کا وجود علی گڑھ یونی ورسٹی کے

---

[1] ڈاکٹر صاحب مولانا سلیمان اشرف کے درسِ قرآن میں شامل ہو کر اُن سے کسب فیض کرتے۔ آپ کی مولانا سے عقیدت و محبت کس درجہ کی تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی کوٹھی 'ذکا منزل' کا سنگِ بنیاد پروفیسر سلیمان اشرف کے ہاتھوں رکھوایا۔ (زبیری، محمد امین۔ 'ضیائے حیات' ص ۲۶۴۔ طبع دین محمدی پریس کراچی۔ سنہ ندارد)

لیے آیۂ رحمت کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ علم و فضل کا بحرِ زخار اور ظاہری و باطنی خوبیوں کا پیکرِ جمیل تھے۔ ہزاروں تشنگانِ علم ان کے فیضانِ علمی سے بہرہ یاب ہوئے اور پھر اپنے اپنے دوائر میں ان کے نام کو روشن کیا۔" [1]

علامہ شبیر احمد خاں غوری فرماتے ہیں۔ حضرت مولانا سلیمان اشرف کی ذاتِ گرامی مرجع اکابر و اعیان تھی، ان کی بارگاہ میں نہ صرف یونی ورسٹی کے اکابر بل کہ ضلع علی گڑھ کے رؤساء عالی مقام اور شہر کے عمال و اعیان (امراء و وزراء) حاضر ہوتے تھے۔ بہ قول ڈاکٹر طلحہ رضوی ان کا آبائی نسب حضور غوثِ اعظم رضی عنہ اور مادری نسب حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی رحمہ تعالیٰ تک پہنچتا ہے۔ سلسلۂ چشتیہ نظامیہ فخریہ سے منسلک تھے۔

مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی لکھتے ہیں کہ مولانا سلیمان اشرف بلاشبہ بڑے فصیح و بلیغ مقرر تھے اور رموز خطابت سے بھی آشنا...... جبکہ بہ قول رشید احمد صدیقی، سید صاحب کو فنِ خطابت [2] میں کمال حاصل تھا:

"آواز میں کڑک اور لچک، دھمک تھی...... خطابت پر آتے تو معلوم ہوتا صفیں اُلٹ دیں گے۔"

خواجہ حسن نظامی نے ۱۹۲۳ء کی 'درویش جنتری' میں سید صاحب کی قادر الکلامی اور شگفتہ بیانی کا ذکر بڑے ہی دل نشیں اور دل کش انداز سے کیا ہے:۔

---

[1] ماہنامہ ضیائے حرم۔ لاہور، جنوری ۱۹۸۷ء، ص ۸۱

[2] 'عام خلقت کو متاثر کرنے کے لیے فصاحت و بلاغت سے زیادہ کارگر حربہ اور کوئی نہیں۔ دنیا کی تمام بڑی بڑی تحریکیں ہمیشہ عامۃ الناس کے دلوں میں جگہ کر کے ابھرتی رہی ہیں، جب کسی قوم پر تباہی کی گھٹائیں منڈلا رہی ہوں تو اس وقت صرف جذبات کی کڑکتی ہوئی بجلی میں ہی یہ طاقت ہوتی ہے کہ ان بادلوں کو چاک کر دے۔ یاد رہے کہ صرف وہی لوگ دوسروں کو جوش میں لا سکتے ہیں، جن کے اپنے دل سینے میں درد سے تڑپ رہے ہوں۔ کیا وجہ ہے کہ بڑے بڑے لیڈروں کے الفاظ میں لوگوں کے دلوں کو موم کی طرح پگھلا کر جس طرف وہ چاہیں ادھر موڑ لینے کی تاثیر ہوتی ہے؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنے اندر جذبات کی بھٹی بھڑکا لینے کی استعداد رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے انقلابات صرف قوت تقریر سے برپا ہوتے ہیں۔' (ہٹلر، ایڈولف۔ 'تزکِ ہٹلری' (مترجم): چشتی، محمد ابراہیم علی۔ نگلشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۸ء۔ ص ۱۶۵)

''تقریر ایسی تیز اور مسلسل کرتے ہیں جیسے ای-آئی-آر کی ڈاک گاڑی۔ دورانِ تقریر صرف درود پڑھنے کے لیے تھوڑی دیر میں وقفہ ہوتا ہے، ورنہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمالہ کی چوٹی سے گنگا کی دھارا نکلی ہے، جو ہردوار تک کہیں رُکنے اور ٹھہرنے کا نام نہیں لے گی۔ بیان کی ایسی روانی آج کل ہندوستان کے کسی عالم میں نہیں ہے۔ تقریر میں محض الفاظ ہی نہیں ہوتے بلکہ ہر فقرے میں دلیل اور علمیت کا انداز ہوتا ہے۔''

جناب سید امیر الدین قدوائی مرحوم تحریر کرتے ہیں:

''حضرت مولانا پروفیسر سیّد سلیمان اشرف صاحب قبلہ بڑے جید عالم اور مُرتاض درویش تھے۔ وہ اپنی طرف سے تفسیر کا درس مُسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی مسجد میں دیا کرتے تھے۔ اور جو لوگ اس میں شرکت کرتے تھے صرف اُن ہی کو شاگرد تسلیم کرتے تھے، وہ فیض کا دریا تھے۔ جس نے حسبِ ظرف جو کچھ اُن سے حاصل کرلیا اُس کی برکت اُسی نے نہیں بلکہ دُنیا نے بھی دیکھی اور اُس سے نفع پایا۔'' [1]

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (۱۹۱۶ء۔۱۹۹۵ء) سابق سربراہ شعبۂ اُردو، جامعہ کراچی ''رفت و بود'' کے زیرِ عنوان رقم طراز ہیں:

''مَیں نے بہت سی یونی ورسٹیاں دیکھی ہیں، بڑے بڑے علما کو دیکھا اور قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے، لیکن سلیمان اشرف جیسا عالم مَیں نے نہیں دیکھا۔ مَیں جب اقبال کے مردِ مومن کا تصور کرتا ہوں اور اپنے آس پاس اسے تلاش کرتا ہوں تو مولنا سلیمان اشرف کا پاکیزہ اور روشن چہرہ میرے سامنے آجاتا ہے۔'' [2]

---

[1] ماہنامہ ''تاج'' کراچی محمود نمبر، جلد ۱۲، شمارہ ۸، ص ۱۱۲

[2] روزنامہ جسارت کراچی، ۲۰ رجون ۱۹۸۰ء، ص ۶

جامع مسجد یونی ورسٹی
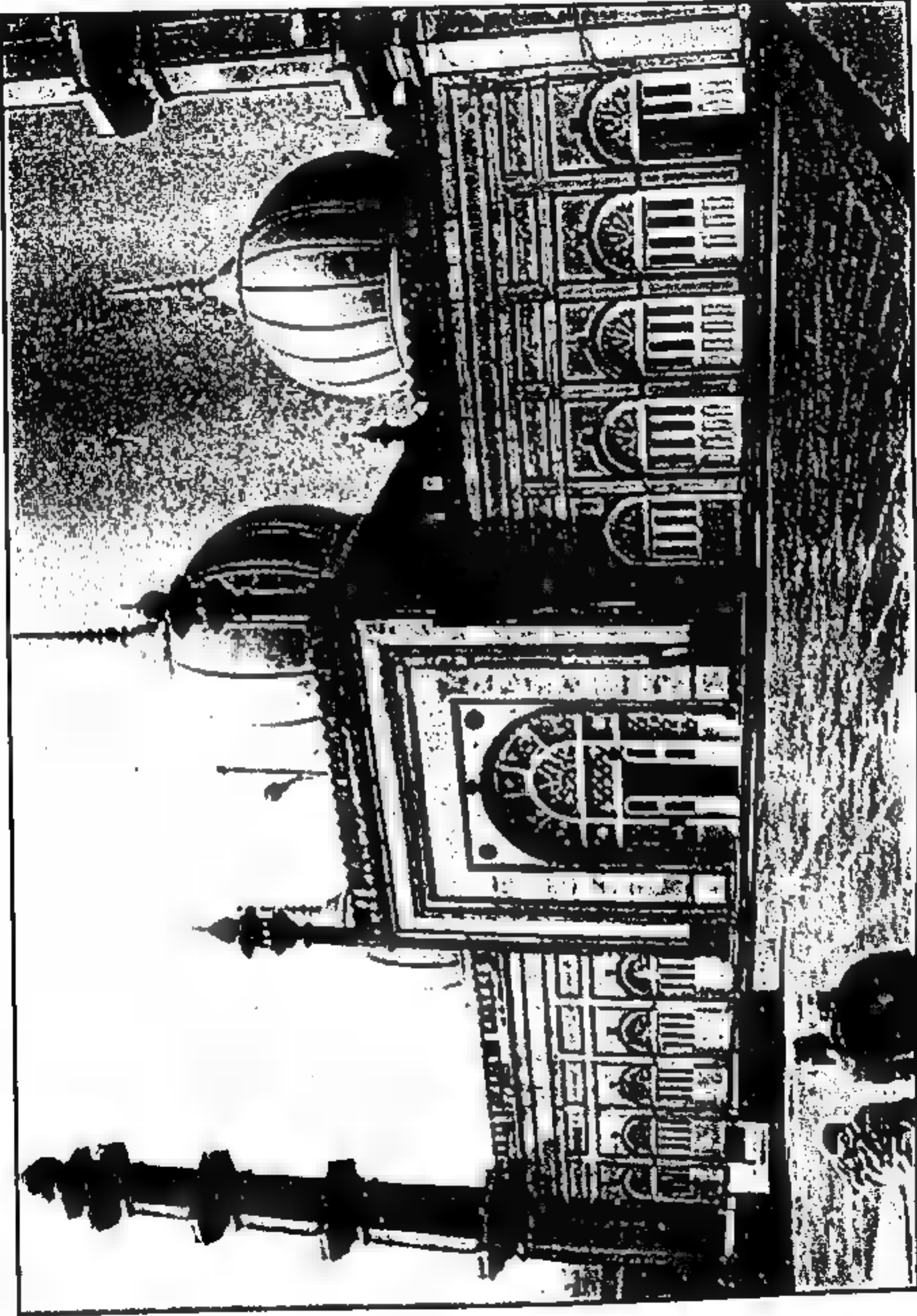
مولانا سلیمان اشرف ایک بالغ نظر مصلح

مولانا سلیمان اشرف ایک بالغ نظر مصلح بھی تھے، اس لیے انھوں نے اپنے لیکچرز اور تحریروں کے ذریعہ مسلم معاشرہ میں در آنے والے بگاڑ اور مختلف خرابیوں کی نشاندہی کر کے اصلاحِ احوال کی پوری کوشش کی۔ آیئے اُن کی کچھ تصانیف سے ایسی مساعی کی چند مثالیں دیکھتے ہیں۔

غیر محرم مرد کے ہمراہ حج و عمرہ:

"آج کل یہ مسئلہ بنالیا گیا ہے کہ اگر عورت کسی ایسی عورت کے ساتھ حج کے لیے جائے جس کے ساتھ اُس کا محرم ہو تو سفر جائز ہوگا۔ ہرگز یہ مسئلہ احناف کے نزدیک مقبول نہیں۔ ایسے مفتی جنھیں اپنے مذہب کے لطائف ونفائس کی خبر نہیں، اُن کے فتاوے سے احتراز چاہیے۔ عورت کے ساتھ جب تک شوہر یا محرم قابلِ اطمینان نہ ہو سفر حرام ہے۔ اگر کرے گی حج ہو جائے گا، مگر ہر قدم پر گناہ لکھا جائے گا۔ محرم وہی ہے جس سے نکاح ہمیشہ کے لیے حرام ہے۔ ہمارے ائمہ احناف کی یہی تحقیق ہے اور یہی مسئلہ حق ہے۔" [1]

آغاز سفر کے لیے بعض دنوں کا نحس خیال کرنا:

"یہ خیال محض عامیانہ ہے کہ بدھ کا دن منحوس ہے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ حضرت محبوبِ الٰہی سیدنا نظام الدین اولیا قدس سرہٗ کی اس دن کے ساتھ عجیب خصوصیت یہ ہے کہ آپ کی ولادت چہار شنبہ کو ہوئی، آپ کی بیعت کا دن چہار شنبہ ہے، شیخ نے جس روز خرقۂ خلافت عطا فرمایا وہ چہار شنبہ کا دن تھا، آپ نے جس روز رحلت[2] فرمائی وہ چہار شنبہ تھا۔" [3]

---

[1] محمد سلیمان اشرف، پروفیسر مولانا: الحج، طبع مسلم یونی ورسٹی پریس۔ علی گڑھ، ۱۹۲۸ء، ص ۳

[2] یہ کیسا اتفاق ہے کہ مولانا سلیمان اشرف کی وفات بھی چہار شنبہ کے روز ہوئی۔

[3] الحج: ص ۳، ۴

کم خوابی و کم خوری:

اطبا متفق ہیں کہ کم کھانا اور کم سونا انسانی صحت کے لیے مفید ہے۔ بسیار خوری اور گھنٹوں لمبی تان کر سونا اگر صحت کے لیے مضر ہے تو نام نہاد ڈائٹنگ سے جسم کو اتنا کمزور کر لینا کہ بیماری کو دعوت دینے کا باعث بنے دونوں انتہا پسندی کا مظہر ہیں۔ اسلام اعتدال کا حکم دیتا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

''شریعتِ محمدی نے مسلمانوں کو کم کھانے اور کم سونے کی طرف بہت ہی رغبت دلائی ہے تاکہ قوائے حیوانیہ کا ایسا غلبہ نہ ہونے پائے جو قوائے ایمانیہ کو مغلوب کر لیں''۔ [1]

شرعی لباس کیا ہے؟:

یہ ایک بے نتیجہ اور خواہ مخواہ کی بحث ہے۔ لباس ستر کے لیے ہے اس کا صاف ستھرا اور پاکیزہ ہونا شرطِ اوّل ہے۔ مولانا اسلام کی مرضی ومنشا بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اسلام نے لباس کے باب میں اس قدر ضرور اصلاح کی ہے کہ متکبرانہ و بے ستر و بے حیائی کا جامہ نہ ہو۔ اور یہ ایک کامل مذہب کا فرض تھا۔ باقی کسی خاص تشخص کو لباس میں کچھ بھی دخل نہیں دیا۔ ہاں شارع علیہ السلام کا لباس بے شک مسنون و موجبِ اجر۔ عبا، جبہ، تہمد قمیص عربی مسنون و محبوب مگر فرض وواجب نہیں''۔ [2]

مولانا مرحوم کو کیا خبر تھی کہ دین کے علمبردار حضرات مخصوص ٹوپیوں اور عماموں کے ساتھ اپنے گروہ کو دوسروں سے الگ اور نمایاں کرنے کا عجیب وغریب وطیرہ اختیار کریں گے اور رنگ برنگے پہناوے کی بدولت ملت کو ٹکڑیوں میں بانٹنے کا (غیر ارادی طور پر ہی سہی) ناپسندیدہ کارنامہ انجام دیں گے۔

---

1. محمد سلیمان اشرف، پروفیسر مولانا: الحج، طبع مسلم یونی ورسٹی پریس، علی گڑھ، ۱۹۲۸ء، ص ۲۳
2. سید سلیمان اشرف بہاری، پروفیسر مولانا: البلاغ، طبع مطبع احمدی، علی گڑھ، ۱۹۱۴ء، ص ۱۵

مسلمانوں کی سیاست دین سے جُدا نہیں:

کم فہمی اور لاعلمی کی بنا پر بعض حضرات اسلام کو زندگی کے تمام شعبوں پر محیط کرنے سے گریزاں ہیں۔ ان کا استدلال ہے کہ اسلام کو صرف عبادت تک ہی محدود رکھا جائے، یہ طرزِ عمل نہایت ہی خطرناک ہے کہ سیاسی اور معاشرتی معاملات میں لوگوں کی راہ نمائی کرنے کے بجائے انھیں حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔ اگرچہ ”دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے دین و دنیا کا ہر پہلو انسانی حیات اور ضروریات کے لیے ایک مکمل ضابطہ پیش کیا، کوئی ایک بھی گوشۂ حیات ایسا نہیں جسے اسلام واضح سے واضح شکل میں پیش نہ کرتا ہو، جہاں وہ روحانی اخلاقی تعلیم دیتا ہے وہیں تمدنی، معاشرتی، تعلیمی، صنعتی، اقتصادی، تجارتی، سیاسی مسائل پر مکمل اصول پیش کرتا ہے، دین و دنیا کو ساتھ لے کر چلتا ہے، وہ دوسرے مذاہب کی طرح رہبانیت نہیں سکھاتا۔“[1] مولانا سلیمان اشرف نے اپنے رسالہ البلاغ کے حصہ اسلام و خلافت میں اسلام...... اُصولِ تمدّن اور اسلام...... اسلام اور سیاست...... اسلام اور حرب...... خلافت...... جیسے عنوان قائم کر کے انسانی ضابطۂ حیات کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ اسلام نے ایسی ضروریاتِ زندگی جو انسانی حیات کے لیے جز ولاینفک ہیں مثلاً تمدّن، سیاست، حرب۔ اس کو خوب حل فرما دیا۔ اور یہ ایک کامل و صادق مذہب کا فرض تھا۔

مولانا ان عناصر سے بھی مخاطب ہوتے ہیں جو اپنی دعوت و تبلیغ میں اسلام کے قانون، اس کے اجتماعی عدل، معاشی مساوات، معاشرتی اور سیاسی نظام کی بات نہیں کرتے، انھوں نے اپنے اجتماعات اور پروگراموں کو محض چند مذہبی مسائل اور وعظ و نصیحت تک محدود کیا ہوا ہے جبکہ قرآن اور کتبِ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں زندگی کے جملہ پہلوؤں پر جامع ہدایات ملتی ہیں، مگر عبادات اور انسان کے تعلق باللہ کی نسبت مجموعہ ہائے حدیث کا بہت بڑا حصہ اجتماعی اور معاشی مسائل، حقوقِ انسانی، مملکت کے انتظامی امور اور قیامِ امن و انصاف کے لیے دیوانی اور فوجداری قوانین

---

[1] فلسفۂ عبادات اسلامی از مولانا محمد عبدالحامد قادری بدایونی، ادارۂ پاکستان شناسی۔ لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۳۲

پر مشتمل ہے۔ مذکورہ رسالہ میں مولانا سلیمان اشرف فرماتے ہیں:

''احکامِ شرعیہ سے جو حضرات کہ ناواقف ہیں۔ اور اُنھیں توفیق اس سے آگاہی کی بھی نہیں ہوتی۔ وہ بر بنائے جہل مرکب[1] یہ کہہ دیتے ہیں کہ اسلام صرف تزکیۂ نفس سکھلاتا ہے باقی اُسے دُنیاوی اُمور میں کوئی دخل نہیں۔ اس تیرہ صدی میں جبکہ الحاد و جہل کی گھٹا مسلمانوں پر اُن کی بد نصیبی کی طرح چھائی ہوئی ہو اس طرح کی آوازیں اور بھی اسلام سے بے پروا کرنے والی ہیں۔ لہٰذا یہ بتلا دینا کہ اسلام ہی ہے جس نے تمدّن و سیاست و حرب تمام دنیا کو سکھلایا۔ ایک نہایت ضروری بات ہے''۔

چناں چہ خالق کے عطا کردہ کامل نظام...... دین حنیف کو من چاہے خانوں میں بانٹنے کی جاری عمومی روش کو ڈاکٹر محمد ارشد (جامعہ پنجاب) نے اپنے مقالے 'اسلامی ریاست کی تشکیل جدید' میں بے بصیرتی، کوتاہ اندیشی اور خود غرضی سے تعبیر کیا ہے کہ کسی قوم کے اجزائے ترکیبی میں جہاں تہذیبی، ثقافتی، سماجی، مذہبی اور روحانی عوامل بے حد اہمیت کے حامل ہیں، لیکن سیاسی شعور سے عاری انسانوں کا کوئی گروہ دیگر تمام تر خصوصیات کے باوصف ایک قوم کہلانے کا مستحق ہرگز نہیں ہے۔ بقول غلام غوث صمدانی علیگ:

خواہی از سیاست دین جُدا　　وای بر تدبیر طبع نارسا
ای ز دین بیگانہ و حق ناشناس　　دینت الحاد و سیاست بے اساس

---

[1] جہلِ مرکب (ع) مذکر و مونث۔ دُہری نادانی، نادان ہونے پر اپنے آپ کو دانا جاننا، کسی چیز پر خلاف واقع اعتقاد کرنا۔ مثلاً سونے کو چاندی اور چاندی کو سونا جاننا۔ دو جہلوں میں گرفتار ہونا، یعنی عدم علم اور ناواقفیت عدم علم، غلط واقفیت (۲) جو علم نہ ہونے کے باوجود خود کو عالم سمجھے۔

؎ آنکس کہ نداند و بداند کہ داند　　در جہلِ مرکب ابدالدہر بماند

حکیم محمد خلیل احمد القادری الجائسی ■

حیاتِ مولانا سلیمان اشرف کی چند جھلکیاں **

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

بلاشک حی وقیوم کے خاص بندے، موت کو اگلے مراتب کے لیے زینہ اور فتح باب بناتے ہیں، بوسیدگی، شکستگی اور بربادی ان کی موت کا دوسرا نام ہے جو محیی ومميت سے کٹ گئے اور فنا کے گھاٹ اتر گئے۔

بقول ڈاکٹر طلحہ رضوی، آپ کا آبائی نسب حضور غوث اعظم رضی عنہ تک اور مادری نسب حضرت مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی رحمہ تعالیٰ تک پہنچتا ہے۔ آپ سلسلۂ چشتیہ نظامیہ فخریہ سے منسلک تھے۔ گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کانپور استاذ الاساتذہ حضرت مولانا احمد حسن رحمہ تعالیٰ کی خدمت میں پہنچ کر کسب علوم دین کی خواہش ظاہر فرمائی۔ استاذ وقت پہلے حدیث اور پھر منطق کی تعلیم دینا چاہتے تھے، لیکن سید صاحب پہلے منطق اور بعد میں حدیث کی تحصیل پر مُصر تھے۔ اپنی رائے پر قائم رہتے ہوئے جون پور حضرت مولانا ہدایت اللہ خاں رحمہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا رحمہ تعالیٰ نے سیدزادہ کی ہر خواہش پر سر تسلیم خم کرنے کو خوش نصیبی سمجھتے ہوئے ہر بات بہ طیب خاطر قبول فرمائی اور اس طرح ایک جوہر شناس ماہر کو ایک گوہر بے بہا مل

■ سابق ریڈر طبیہ کالج۔ علی گڑھ

■ مضمون موصولہ ہمراہ گرامی نامہ بنام ظہور الدین خاں از بیت النور، سرسید نگر۔ علی گڑھ مورخہ ۱۱ر اگست ۱۹۸۶ء

گیا۔آپ نے لمحہ بہ لمحہ اپنی ذہانت وصلاحیت کے خیرہ کن جواہر ریزے بکھیرنا شروع کردیے، اور آخرکار آپ کی جلالت، علم وفضل اور عشقِ رسول نے آپ کی شخصیت کو ایسا تراشا کہ خود جوہری اپنے گوہر کی آب وتاب سے خیرہ ہوکر اس کا عاشق ہوگیا۔ چناں چہ ایک بار جون پور میں ایک محفل میلاد مقدس میں سیّد صاحب علم وحکمت اور عشقِ رسول کی فضا کو معنبر ومعطر فرمانے میں محو تھے کہ ایک مرقعِ علم وحکمت نے منبر پر پہنچ کر فورِ محبت سے سرشار اور وارفتہ سید صاحب کو سینہ سے چمٹا لیا اور پیشانی کو بوسہ دینے لگے۔ یہ تھے آپ کے استاذ حضرت مولانا ہدایت اللہ خاں رضی عنہما۔ سیّد صاحب بھی اپنے استاذ کے پروانہ تھے۔ آخری سانس تک استاذ پر جان نچھاور کرتے رہے اور جب استاذ نے اپنے خالق کے حکم کو لبیک کہا، تو آپ نے ہوش وحواس کھودیا۔ عرصہ تک کھوئے کھوئے سے رہے۔ آخرکار اسی مدرسہ میں تدریس اور استاذ مرحوم کی نیابت کے فرائض کو قبول فرما لیا۔ ایک مناسب موقع پر سیّد صاحب کے عقیدت مند مولوی جواد علی صاحب نے آپ کے علم میں لائے بغیر علی گڑھ کالج کے شعبۂ دینیات کے استاذ کی ایک جگہ کے لیے درخواست دے دی۔ پھر انھی کے اصرار پر ۱۹۰۸ء میں آپ بحیثیت استاذ شعبۂ دینیات علی گڑھ تشریف لائے۔

آپ کے حاسدین ومفترین نے آپ کے قیامِ علی گڑھ کے دوران جو جو گل کھلائے اس کا تذکرہ کئی مستند مضامین میں آچکا ہے۔ یہاں بسلسلۂ تقرر ایک واقعہ پیش کررہا ہوں، جو بورڈ اس جگہ کے استاذ کے انتخاب کے لیے مقرر کیا گیا تھا اس میں ایک اہم رکن نواب مزمل اللہ خان صاحب رئیس بھیکم پور بھی تھے۔ تقرر کے لیے غور وخوض اور فیصلہ کے وقت نواب صاحب موجود نہ تھے اور ان کی شخصیت کے پیش نظر ان کی رائے بہر حال قابلِ اعتنا اور ناگزیر تھی۔ نواب صاحب نے حضرت کے تقرر کے لیے یہ شرط پیش کی کہ مولوی حسین احمد صاحب مدنی ان کی قابلیت کی تصدیق کردیں، جو اتفاقاً علی گڑھ ہی میں موجود تھے۔ نواب صاحب نے شب میں دعوت اور دوسرے دن جلسۂ سیرت پاک کا پروگرام مرتب کیا۔ اب حضرت کی جلالتِ شان، صلابتِ ایمان، کمالِ جرأت واستغنا کی ایک جھلک قارئین ملاحظہ فرمائیں۔ شب کی دعوت میں حضرت مدعو تھے، وہاں پہنچ کر کھانے سے لے کر نشست وبرخاست تک فرقِ مراتب دیکھ کر آپ کی رگ
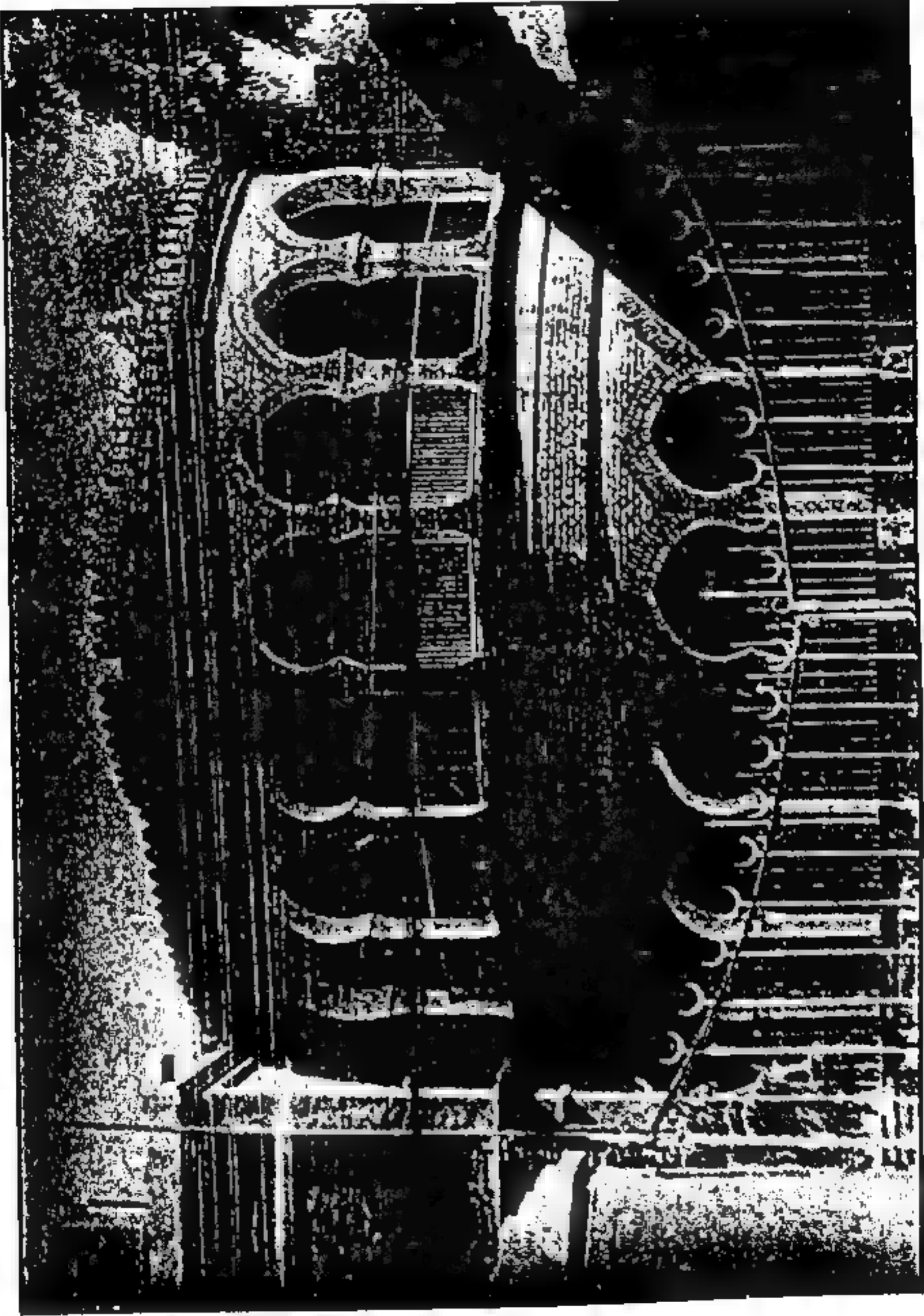
آدم جی پیر بھائی منزل کا سامنے کا منظر
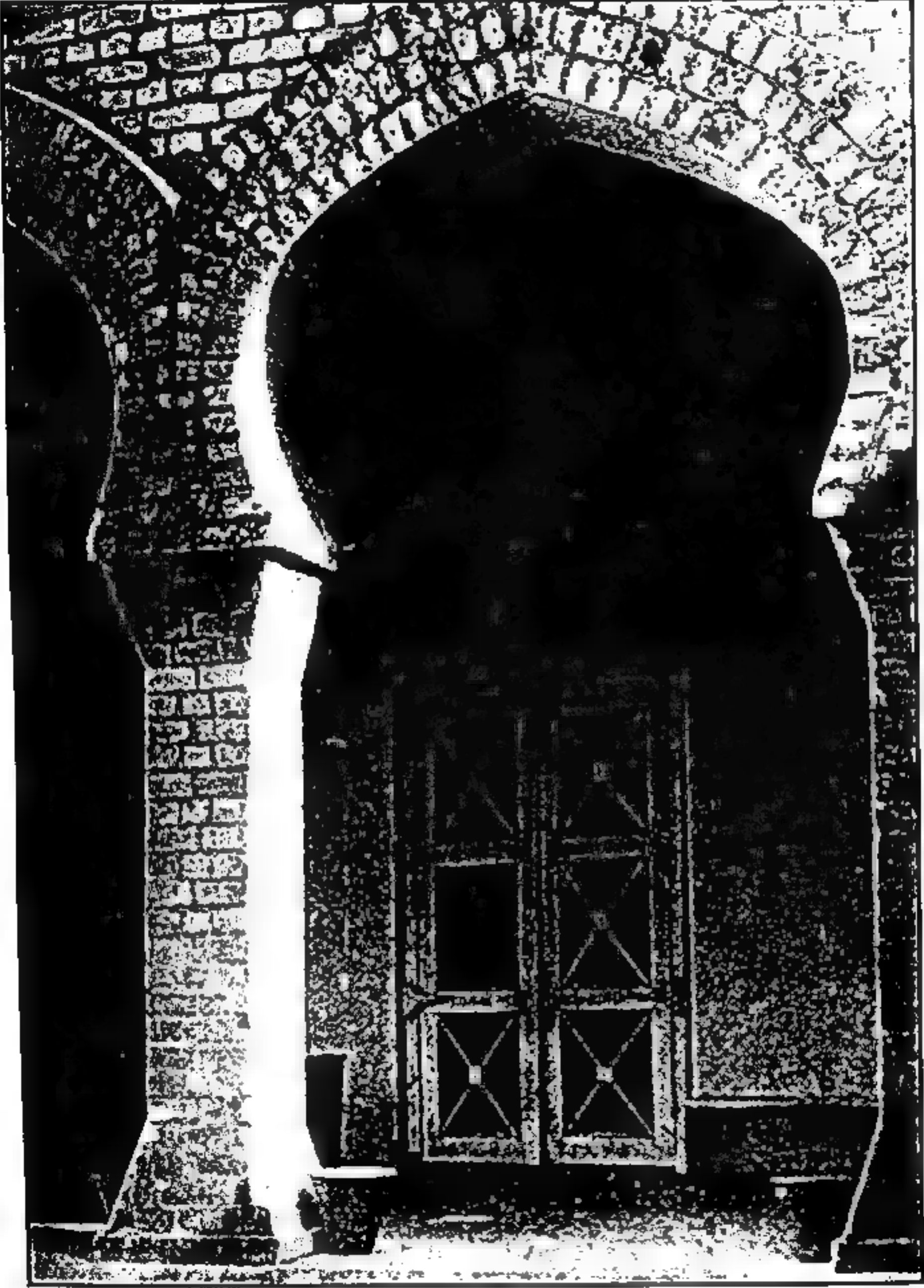
آدم جی پیر بھائی منزل کے اندر یادگار پتھر

ہاشمی بھڑکی اور سخت ناراضگی و ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کھانے میں شرکت کیے بغیر اپنے دوست نواب صدر یار جنگ کے یہاں واپس آ گئے۔ واقعہ سن کر صدر یار جنگ آپ کے تقرر کے سلسلہ میں بے حد متفکر ہوئے، لیکن آپ سراپائے استغنا اپنے معمولات میں مصروف رہے۔ صبح حسبِ پروگرام نواب صاحب کی کوٹھی پر جلسہ سیرت پاک میں آپ کی تقریر ہوئی۔ آپ کے تبحر، جوشِ بیان اور قوتِ استدلال نے عوام تو عوام خواص کو بھی متحیر کر دیا حتیٰ کہ مولوی حسین احمد صاحب مدنی حضرت کی مدلل تقریر سے مبہوت ہو گئے۔ سیّد صاحب سے عرض کر دیا گیا تھا کہ مدنی صاحب سلام و قیام کے قائل نہیں ہیں، آپ نے اسی کو اپنا موضوع تقریر بنایا اور آیات و احادیث کی ایسی بوچھار کی کہ خود مولانا دورانِ تقریر تصویر حیرت و حیران بنے رہے، اور جب سیّد صاحب صلوٰۃ و سلام کے لیے کھڑے ہوئے، تو مولانا مدنی بھی بے ساختہ اور مودّبانہ کھڑے ہو گئے۔ پھر جب سیّد منبر سے اترے تو مولانا مدنی نے والہانہ انداز میں اُٹھ کر انھیں سینہ سے لگا لیا اور کہا کہ میرا تو خیال تھا کہ مولانا ہدایت اللہ خاں کے یہاں منطق و فلسفہ ہی کا شور وشورہ ہے، آج معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث کے بحرِ ذخار کی شناوری میں ان کے شاگرد تک (نہایت) مہارت رکھتے ہیں۔ مولانا مدنی نے یہ تک کہہ دیا کہ اب مَیں قیام کا قائل ہو گیا۔ نواب صاحب نے اشارہ کیا کہ سیّد صاحب اس داد پر مولانا کا شکریہ ادا کریں۔ آپ نے برجستہ فرمایا 'ان دادوں کی کیا حیثیت ہے؟ مجھے داد اُس بارگاہ سے ملتی ہے جو اپنے محب و مولیٰ کی عنایت سے قاسم بھی ہے مختار بھی'۔

آپ کی شخصیت عزتِ نفس، غیرتِ علم، قلندریت اور دانش وری کا مرقع تھی۔ "آدم جی پیر بھائی منزل" کے ایک حصہ کو اپنا بسیرا بنا لینے والے اس مردِ مومن اور صوفی باصفا نے زندگی کی وہ طرح ڈالی جس سے ہزاروں زندگیوں نے روشنی لی اور خود بھی منارۂ علم و عمل بنے۔ وائس چانسلر سر ضیاء الدین آپ کے حضور میں حاضری کو باعثِ فخر سمجھتے تھے اور اہم مسائل میں آپ کی اصابتِ رائے سے ہمیشہ استفادہ کرتے رہتے تھے۔ ریاضی کی چند گتھیوں کو سلجھانے کے لیے حضرت ہی کے مشورہ پر انھی کی معیت میں سفرِ جرمنی کو بریلی کی طرف موڑ دیا اور چٹکیوں میں حل ہونے والی گتھیوں کے واقعہ پر برِ عظیم کے عظیم ماہر ریاضیات ہمیشہ کے لیے نہ صرف حضرت بلکہ امام اہلسنّت

کی غلامی کا دم بھرنے لگے۔ پروفیسر ظفر الحسن کے تحقیقی مقالہ کے اصل روح رواں سیّد صاحب ہی تھے۔ علمِ دین کی حرمت کا یہ عالم تھا کہ کبھی کانووکیشن میں شریک نہیں ہوئے۔

عربی، فارسی اور منطق وفلسفہ کے پروفیسران اپنی گتھیوں کو لے کر طالب علمانہ آتے اور نئی روشنی و نئے عزم کے ساتھ کلاس جاتے۔ گفتگو میں علم و فضل کی جلالت و متانت کے ساتھ ساتھ خوش طبعی اور مزاح لطیف کی کلیاں بھی کھلتی رہتیں۔ خود فراموشی اور قلندریت نے اگر ایک جانب سادگی اور سادہ مزاجی کا سبق آموز نقشہ پیش کیا، تو دوسری طرف نزاکتِ طبع نے رؤساءِ وقت کو انگشت بدنداں کر دیا۔ گرمی کی آگ، سردی کی برفانیت، برسات کا طوفانِ بادو باراں ہمیشہ ایک ہی جگہ پر آپ کے قیام گاہ کی استقامت کو چومتی اور آگے بڑھی ہیں۔ صدر یار جنگ جو خود بھی متبحر عالم اور مولنا ابوالکلام آزاد جیسے لوگوں سے مراسلانہ ربط رکھتے ہمیشہ عصر ومغرب کی نماز آپ کے فقیر کدہ پر آپ کی امامت میں پڑھتے۔ اور گھنٹوں علمی پیاس بجھاتے رہتے۔ سیّد صاحب کی مرقدِ انور اور قیام گاہ کے سنگِ مرمر پر کندہ کتبے سیّد صاحب کے حضور آپ کی عقیدت بلکہ والہانہ عشق اور کمالِ علم وفضل کے آئینہ دار ہیں۔ سیّد صاحب کی تنہا ''المبین'' ایک دائرۃ المعارف یا انسائیکلوپیڈیا ہے جو ایک نئے فن کی ایجاد کا سرچشمہ اور حضرت کے لسانی اور ادبی نابغیت کی زندہ تصویر ہے۔ اگر آپ اسی پر بس کرتے تو اس سے ہزاروں کتابیں وجود میں آسکتی اور جنم لے سکتی تھیں۔

آپ نے تصنیفی زندگی میں مقدار، حجم اور تعداد کو نہیں بلکہ ضرورتِ وقت، مسائل کی اہمیت کو فوقیت دی۔ دینی علمی، سیاسی سماجی وغیرہ موضوعات میں جب بے راہ روی، گم رہی اور اسلام و جمہور کو نشانہ بنتے دیکھا فوراً آپ کے قلم نے پتھر کی لکیر کھینچ دی اور زبان و بیان، سلاست وفصاحت کے ساتھ دلائل و براہین کے وہ انبار لگا دیے کہ مخالف بھی سوچنے اور ماننے پر مجبور ہوا۔ المبین، النور، البلاغ، الانہار، السبیل، الخطاب، الحج وغیرہ آپ کے اس نظریہ تصنیف کے ترجمان ہیں۔

آپ کے مزار مبارک پر یہ زندہ کرامت دیکھنے میں آئی کہ کھجور کا جو درخت مزار انور پر سایہ فگن ہے اس کی تمام شاخیں مردہ اور خشک ہو چکی ہیں، لیکن وہ شاخیں تر و تازہ اور شاداب ہیں،

مزار مبارک کے مقابل لوح پر منظوم تاریخ وصال

مرقد مبارک کا کتبہ

جنھیں خاص مزار انور (یعنی لوحِ مزار یا تعویذ قبر) پہ سایہ فگنی کا شرف حاصل ہے۔

ذیل میں لوحِ مزار کی منظوم تاریخ وصال اور قیام گاہ کی تحریر کی نقل درج کی جارہی ہے۔

مرقد

مولانا سید سلیمان اشرف بہاری نظامی فخری میر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی

تاریخ رحلت ۵ ربیع الاوّل ۱۳۵۸ھ روز چہار شنبہ

سلیمان اشرف بر اہل تقوے
بہ علم و عمل والۂ دین اشرف
چو نفسش شنید ایۂ ارجعی را
بہ جنت شد از قربتِ حق مشرف
سنش از دلِ پاک حسرتؔ نوشتہ
بہ جنات عدنِ سلیمان اشرف

۱۳۵۷
۱
۱۳۵۸ھ

از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی المتخلص بہ حسرتؔ

سید صاحب کا مزار مبارک قبرستان مسلم یونی ورسٹی کے شرقی غربی گوشہ میں قبرستان[1] (جس کو منٹو سرکل بھی کہتے ہیں) کی چہار دیواری کے اندر ایک چھوٹی چہار دیواری میں واقع ہے، جو

[1] ''قبرستان کے شمالی حصے میں ایک چار دیواری کے اندر چند قبریں نظر آتی ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں قبر مولانا سید سلیمان اشرف مرحوم کی ہے۔ مولانا شعبۂ دینیات کے سربراہ تھے اور میلاد خوانی کی محفلوں میں خاص طور پر مدعو کیے جاتے تھے۔ ان کا سالِ وفات ۱۳۵۸ھ ہے۔ ''بہ جنات عدنِ سلیمان اشرف'' سے ۱۳۵۷ھ برآمد ہوتے ہیں۔ ماہرینِ فنِ تاریخ نے ایک عدد کی رعایت دی ہے۔'' (محمد اسلم، پروفیسر۔ ''سفر نامۂ ہند''، ریاض برادرز۔ لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۴۷) ناشر

نواب صدر یار جنگ کی خصوصی عقیدت کی نشانی ہے۔ اس چہار دیواری میں نواب فیملی کے علاوہ اور بھی قبریں ہیں جن کی کثرت اگر ایک طرف وفورِ عقیدت وحصولِ فیوض و برکات کی مظہر ہے تو دوسری طرف زائرین کی حاضری میں سدِ راہ بن گئی ہے۔ نیز قبرستان ایک دوسرے عقیدہ کے فرد کے انتظام میں ہے اس لیے مناسب دیکھ بھال اور حفاظت (یعنی Maintenance) کے نہ ہونے سے مستقبل میں بوسیدگی بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔

حضرت قدس سرہٗ کی قیام گاہ پر سنگِ مرمر پر کندہ حسبِ ذیل تحریر ہے:

۷۸۶

بیادگار

مولنا سیّد سُلیمان اشرف صاحب مرحوم ومغفور

صدر شعبۂ دینیات مُسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ متوطن بہار شریف (بہار)

جنھوں نے

تیس (۳۰) سال مُسلسل ''آدم جی پیر بھائی منزل'' کے اِس حصّے میں

مستقل قیام فرمایا۔ اپنی حمیتِ دین، فضیلتِ علم، اصابتِ فکر اور

ستودگی سیرت سے اِس درسگاہ کو سَر بلند رکھا اور سَر بلند تر ہے

راہ روانِ شوق از ما سالہا آرند یاد

نقشہا انگیخت در راہِ محبت گامِ ما

تاریخ رحلت ۵ ربیع الاوّل ۱۳۵۸ھ مطابق ۲۶ اپریل ۱۹۳۹ء (حسرت شروانی)
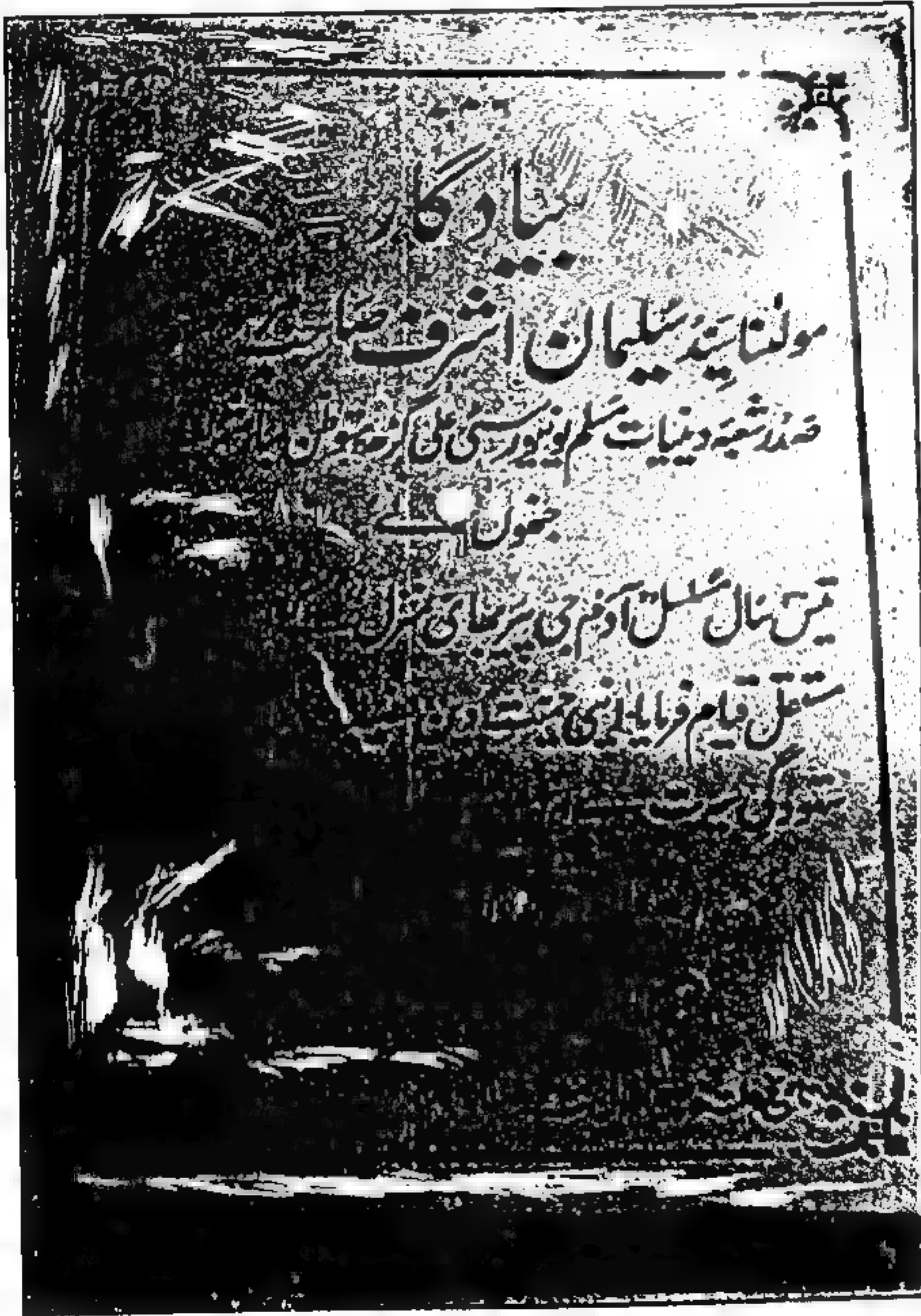
یادگار پتھر کا واضح منظر

سخن ہائے گفتنی

مولانا سیّد سلیمان اشرف گزشتہ صدی کے ان علمائے ذی اکرام میں سے ہیں جن کی ذات علم وعمل کی جامع تھی۔ انھیں علوم شرعی کے ساتھ ساتھ شعر وادب سے بھی طبعی مناسبت تھی۔ فلسفہ ومعقولات کے ماہر تھے تو لسانیات پر بھی عبور تھا۔ مولانا سلیمان اشرف تقریباً ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں محلہ میر داد (پٹنہ، بہار) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولانا حکیم سید عبداللہ اپنے عہد کے فاضل طبیب وعالم تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب مخدوم سیّد اشرف سمنانی کچھوچھوی کے بھانجے سیّد عبدالرزاق جیلانی سے جا ملتا ہے، تاہم اس خانوادے کے اراکین مخدوم سمنانی کی طرف منسوب ہو کر اشرفی کہلاتے ہیں، خود مولانا کے نام کے ساتھ اشرف کا لاحقہ اسی نسبت سے ہے۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے اعمام محترم سے حاصل کی۔ مولانا کے چار چچا تھے۔ مولانا عبدالقادر، مولانا عبدالرزاق، مولانا عبدالغنی اور مولانا عبیداللہ۔ چاروں ہی سے مختلف اوقات میں مختلف کتابیں پڑھیں۔ اسی دوران مولوی رمضان علی سے بھی کسب علم کرتے رہے۔ اس کے بعد بہار اسکول میں داخلہ لیا۔ دسویں کلاس تک پہنچے تھے کہ طبیعت دینی تعلیم کی طرف شدت سے مائل ہوئی۔ اسکول کو خیر باد کہا اور مولانا نور محمد اصدقی (خلیفۂ اعظم شاہ قیام اصدق، پیر بگھہ جموانواں) سے عربی وفارسی کی تعلیم لی۔ اسی دوران ان کے دامن عقیدت سے وابستہ ہوئے اور اخذ طریقت کیا۔ اس کے بعد مولانا مولانا حکیم سیّد وحید الحق استھانوی (م: ۱۳۱۵ھ) کے قائم کردہ ''مدرسہ اسلامیہ'' استھانواں (قیام ۱۳۰۱ھ) میں مولانا سیّد محمد احسن استھانوی بہاری سے اخذ علم کیا۔ یہ مدرسہ بہار میں دیوبندی احناف کا پہلا نمائندہ مدرسہ تھا۔ یہاں یہ دلچسپ امر بھی لائق ذکر ہے کہ

اس مدرسے کے بانی مولانا سید وحید الحق اور اس کے اوّلین مدرس مولانا سید محمد احسن مشہور اہل حدیث عالم سیّد نذیر حسین محدث دہلوی (م: ۱۳۲۰ھ) کے تلمیذ رشید تھے۔

"مدرسہ اسلامیہ" کے بعد مولانا نے اپنی تعلیمی زندگی کا کچھ عرصہ مولانا احمد حسن کان پوری کی درسگاہ اور "دار العلوم ندوہ" میں بھی بسر کیا۔ اس کے بعد "مدرسہ حنفیہ" جون پور میں مولانا ہدایت اللہ خاں رام پوری سے اخذ علم کیا۔ مولانا ہدایت اللہ منطق و معقولات میں اپنے زمانے کے امام تھے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کے شاگرد رشید تھے۔ مولانا نے منطق و معقولات میں اسی خیر آبادی سرچشمۂ علم سے فیض اُٹھایا۔ ان کے اساتذۂ عالی مرتبت کے علاوہ مولانا کے اساتذہ میں ایک قابل ذکر نام مولانا یار محمد بندیالوی (م: ۶/ دسمبر ۱۹۴۷ء) کا بھی ہے۔

مولانا سلیمان معقولات کے عالم، لسانیات کے ماہر، فقیہ و مدرس اور ادیب تھے، لیکن طبعاً وہ اوّل تا آخر ایک صوفی تھے۔ ان کے تصوف کی سب سے بڑی خوبی ان کی سلامت روی اور وسیع المشربی تھی۔ یہاں اس غلط العام خیال کی تردید ضروری ہے کہ مولانا سلیمان اشرف، مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے تلمیذ و خلیفہ تھے۔ بعض اہل علم نے بر بنائے عقیدت مولانا سلیمان اشرف کو فاضل بریلوی کے اجلہ خلفا میں محسوب کیا ہے۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مولانا سلیمان کو فاضل بریلوی سے شدید عقیدت تھی مگر یہ تعلق عقیدت و ارادت تلمذ و خلافت کی نسبت کے بغیر تھا۔ خود مولانا بریلوی نے 'ذکر احباب و دعاء احباب' کے عنوان سے اپنے خلفا کے ناموں کو منظوم کیا ہے جس میں اپنے چودہ (۱۴) اکابر خلفا کے نام درج کیے ہیں ان میں مولانا سلیمان کا نام شامل نہیں۔ اسی طرح جب مختلف حضرات نے خود کو مولانا بریلوی کا تلمیذ رشید و خلیفہ ارشد باور کرانا شروع کیا، تو مولانا بریلوی کو ضرورت محسوس ہوئی کہ ان جعلی خلفاؤں سے اظہار برأت کی جائے لہٰذا انہوں نے ضروری اعلان کے تحت ایک اشتہار شائع کرایا جس میں اپنے پچاس (۵۰) خلفا کے نام درج کیے ان میں بھی مولانا سلیمان اشرف کا نام شامل نہیں۔ اگر مولانا سلیمان، فاضل بریلوی کے خلیفہ ہوتے تو کیا ممکن تھا کہ انھیں نظر انداز کر دیا جاتا؟ مولانا نے مسلم یونی ورسٹی

علی گڑھ جیسی مرکزی درسگاہ میں بیٹھ کر سالہا سال درس وتدریس کی ذمہ داریاں نبھائیں مگر ان کے کسی شاگرد نے اور نہ ہی کسی معاصر نے انہیں مولانا بریلوی کی خلافت سے منسوب کیا حتیٰ کہ مولانا سلیمان کے سوانح نگار محمد علی اعظم خاں قادری نے اپنی کتاب ''حیات و کارنامے۔ سید سلیمان اشرف بہاری'' میں مولانا بریلوی سے ان کی عقیدت کا ذکر تو کیا مگر ان سے نسبت تلمذ وخلافت کا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔

مولانا سلیمان کی وسیع المشربی نے انھیں ہر طبقے میں ہر دلعزیز بنا دیا تھا۔ ان کے مراسم اپنے نقطۂ نظر کے مخالف علما واہلِ علم کے ساتھ بھی بڑے خوشگوار تھے۔ مولانا کا دینی وسیاسی مسلک مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے مسلک کے مطابق تھا۔ اپنے مسلک میں شدت سے وابستگی کے باوجود انھوں نے دوسرے مکاتب فکر کے اہل علم کے ساتھ احترام کا رشتہ کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ان کی تحریر وتقریر میں کبھی سوقیت طاری نہیں ہوئی۔ اسی طرح اپنے نقطۂ نظر کے مخالف علما، اشخاص واداروں کے محاسن کا ذکر کرنے سے مولانا کے قلم نے بخل سے کام نہیں لیا۔ عربی مدارس میں اصلاح اور انگریزی کی شمولیت کا خیال سب سے پہلے مولانا ابو محمد ابراہیم آروی (م:۱۳۱۹ھ) کے دل میں آیا تھا جسے انھوں نے عملی شکل (مدرسہ احمدیہ آرہ) میں مرتسم کیا۔ عام طور پر مورخین اس کا ذکر نہیں کرتے۔ مگر مولانا سلیمان اشرف نے باوجود اختلاف مسلک ومشرب تسلیم کیا کہ:

''اگر خصوصیت ملی اور امتیاز قومی کی حیات تشنۂ آب علوم اسلامیہ تھی تو قوام جسم کا نظام اپنے بقا اور نمو کے لیے انگلش زبان کا بھوکا تھا حکماء امت کی دور بین نگاہوں نے اسے دیکھا اور عربی مدارس کے اصول تعلیم میں تغیر وتبدل کے لیے آمادہ ہو گئے خالص مدارس عربیہ میں کچھ انگریزی کی تعلیم داخل کی گئی نیز طریقۂ تعلیم میں بھی سہولت کی راہ پیدا کی گئی۔ فقیر کے علم میں سب سے پہلے مدرسہ احمدیہ آرہ نے اس کی بنیاد رکھی۔ صرف ونحو کی بعض کتابیں سہل اصول پر تصنیف ہو کر وہاں سے شائع ہوئیں اور کچھ انگریزی کا سیکھنا لازم قرار دیا گیا۔'' (السبیل: ۲۰)

اسی طرح جب ایک ملحد کی تردید مسئلہ ڈاڑھی پر ''نزہۃ القال فی لحیۃ الرجال'' لکھی تو اس میں مولانا ابو محمد ابراہیم آروی، مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری، مولانا ابو عبدالرحمٰن عبداللہ ہزاروی ثم گیلانی وغیرہم کے فتوے بھی درج کیے۔ یہ مولانا سلیمان کی وسعتِ قلبی کی واضح دلیل ہے۔

مولانا مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے لائق تکریم استاد تھے جہاں مختلف الخیال علما و اہل علم موجود رہتے تھے۔ مولانا بھی اس بزم کے ایک رکن تھے۔ مولانا کو ارباب دولت سے کبھی سروکار نہیں رہا۔ اللہ نے انھیں غنائے قلب کی دولت سے نوازا تھا۔ انھوں نے تازیست کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی اور نہ ہی کسی سے اپنے جاہ و مرتبے کی امید باندھی۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''مرحوم خوش اندام، خوش لباس، خوش طبع، نظافت پسند، سادہ مزاج اور بے تکلف تھے، ان کی سب سے بڑی خوبی، ان کی خودداری اور اپنی عزتِ نفس کا احساس تھا، ان کی ساری عمر علی گڑھ میں گزری، جہاں امرا اور ارباب جاہ کا تانتا لگا رہتا تھا مگر انھوں نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی اور نہ ان میں سے کسی سے دب کر یا جھک کر ملے، جس سے ملے برابری سے ملے اور اپنے عالمانہ وقار کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر علی گڑھ کے سیاسی انقلابات کی آندھیاں بھی ان کو اپنی جگہ سے ہلا نہ سکیں۔ علی گڑھ کے عشرت خانہ میں ان کی قیام گاہ ایک درویش کی خانقاہ تھی، یہاں جو آتا، جھک کر آتا، اگر مجلس سازگار ہوئی تو دعائیں لے کر گیا ورنہ الٹے پاؤں ایسا واپس آیا کہ پھر اُدھر کا رخ نہ کیا۔'' (یادرفتگاں: ۱۸۹-۱۹۰)

مولانا نہایت نیک نفس تھے، دوسروں کی ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے۔ اپنے استاد کے داماد کو ملازمت دلوائی۔ اور ان کے بیٹے کے تعلیمی اخراجات کے کفیل ہوئے۔ پڑھا لکھا کر انھیں یونی ورسٹی میں ملازمت کے قابل بنایا لیکن پھر اس کی ضرورتوں کا خیال رکھتے رہے۔ اپنے ایک بھانجے سید متین کی کفالت کی۔ مولانا کے ایک بڑے بھائی سید انیس اشرف جو محکمہ پولیس میں آفیسر تھے ان کا دماغی توازن خراب ہو گیا تھا۔ انھیں اپنے پاس رکھا اور جس جانفشانی سے ان کی

خدمت کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ بقول سیّد سلیمان ندوی:

''اپنی ضعیف والدہ کی اطاعت اور اپنے ایک دیوانہ بھائی کی رفاقت اور خدمت میں عمر اس طرح گزاری کہ اس کی نظیر مشکل ہے۔'' (حوالۂ مذکور)

مولانا مدت العمر شادی سے گریزاں رہے۔ اپنی والدہ مکرمہ کے شدید اصرار پر آخری عمر میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے مگر کوئی اولاد نہ ہوئی۔

مولانا کے علم و فضل اور ان کے طرز خطابت و وعظ کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر ابرار حسین فاروقی لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا سید سلیمان اشرف مرحوم و مغفور کے علم و فضل کا اندازہ وہ لوگ خوب کر سکتے ہیں جنھوں نے ممدوح سے درس لیا یا ان کے مواعظ حسنہ سنے۔ ان کا وعظ سیدھے سادے الفاظ میں تصنع، تکلف اور لفاظی کے بغیر بڑا دلکش ہوتا تھا۔'' (ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ۔ فروری ۱۹۷۵ء)

مولانا اپنے نقطۂ نظر کے اظہار میں بڑے جری و بیباک تھے۔ کسی مخالفت کی پروا نہ کرتے تھے، جب ہندوؤں کے سیاسی اثر سے مسلمان زعما بھی ذبیحہ گاؤ کو مصلحتاً ترک کر دینے پر آمادہ ہو گئے تو مولانا سید سلیمان اشرف نے اس کی سختی سے تردید کی۔ اپنی گراں قدر کتاب ''الرشاد'' میں اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی۔ مولانا سلیمان اشرف کے علاوہ بہار کے جن علما نے ذبیحہ گاؤ کی حمایت میں سرگرمی سے حصہ لیا ان میں مولانا حکیم محمد ادریس دیانوی اور مولانا محمد شموئیل عظیم آبادی وغیرہم قابل ذکر ہیں۔ موخر الذکر کی کتاب ''عید المومنین'' کے عنوان سے پٹنہ سے طبع ہوئی جس پر اوّل الذکر کی تقریظ ہے۔

مولانا سلیمان کی زندگی کا ایک قیمتی اور روشن پہلو ملت اسلامیہ کے لیے دلِ دردمند رکھنے والے غم خوار کا تھا۔ ان کا سینہ امت مسلمہ کی زبوں حالی سے غم زدہ تھا اور ان کی آنکھیں زوالِ امت پر اشکبار تھیں۔ وہ دین اور سیاست کی تفریق کے سخت مخالف تھے۔ خود فرماتے ہیں:

”جو مذہب اپنی حفاظت نہیں کر سکتا اور اپنی ماموں زندگی کے لیے طاقت روا نہیں رکھتا ہے اُس کا وجود محالاتِ عادیہ میں سے ہے اور وہ ایک فلسفۂ خیالی سے زائد مرتبہ نہیں رکھتا۔ وہ ہاتھ جس میں اخلاقِ حسنہ کی کتاب ہو نہایت ہی مقدس و واجب التعظیم ہے اُس کو بوسہ دیجیے آنکھوں پر رکھیے۔ لیکن سلامت وہی ہاتھ رہ سکتا ہے، جس میں خونچکاں شمشیر کا قبضہ دکھلائی دے۔“ (البلاغ، اسلام وخلافت: ۲-۳)

وہ مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کو ناپسند کرتے تھے اور استعمار کے ہاتھوں کھلونا بننے کو انتہائی معیوب سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کی طاقت کو جب ضُعف و اضمحلال نے آلیا تو استعمار کو دراندازی کا موقع ملا۔

مولانا نے کئی کتابیں تالیف فرمائیں۔ عربی زبان کی اہمیت وافادیت پر ان کی ایک کتاب ”المبین“ ہے جس پر ہندوستانی اکیڈمی نے انھیں ایوارڈ اور پانچ سو روپیہ نقد انعام دیا۔ ”النور“، ”البلاغ“، ”الرشاد“، ”الحج“، ”السبیل“ اور ”نزہۃ المقال فی لحیۃ الرجال“ بھی ان کے تحریری ذخیرے میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ”ہشت بہشت“ پر ان کا فاضلانہ مقدمہ موسوم بہ ’الانہار‘ فن شاعری میں ان کے درک کا مظہر ہے۔ ”الخطاب“ ان کا لکچر ہے جو کتابی شکل میں شائع ہوا۔ ”مسائل اسلامیہ“ کے عنوان سے ان کے مختلف مواعظ کا ایک مجموعہ ان کے تلمیذ مولوی عبدالباسط نے جمع کیا۔ خیال ہے کہ ان کے لکچر کے اور مجموعے بھی شائع ہوئے ہوں گے، تلاش وجستجو کی جائے تو مزید مل سکتے ہیں۔

مولانا سید سلیمان اشرف اپنے عہد کے کثیر الدرس مدرس اور وسیع المشرب عالم تھے۔ انھوں نے پوری زندگی اس شان سے گزاری کہ علما کے وقار کو مجروح نہ ہونے دیا۔ تا آنکہ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ/ ۲۷/اپریل ۱۹۳۹ء میں اس عالم رفیع القدر نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کی وفات پر ”علی گڑھ میگزین“ نے اپنی جولائی ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں ان

خیالات کا اظہار کیا:

''یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم میں جوہر قابل اوّل تو پیدا ہی نہیں ہوتے اور اگر شاذ و نادر پیدا بھی ہوتے ہیں تو ان کی ہستی زیادہ پائندہ نہیں ہوتی۔ گزشتہ چند سالوں میں مسلمانوں کو بعض ممتاز ہستیوں کی اچانک موت سے ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ انھیں میں ایک وہ گوشہ نشین فاضل اجل تھا جس کی ذات سے علی گڑھ میں فیض کا ایک چشمہ جاری تھا۔ الحاج مولانا سید سلیمان اشرف صاحب جو شعبۂ دینیات مسلم یونی ورسٹی کے صدر تھے تھوڑے عرصہ علیل رہ کر رحلت فرماگئے۔ مرحوم مسلسل تیس سال تک تفسیر قرآن کا درس دیتے رہے۔ اس طویل مدت میں مولانا سے جو فیض ان کے شاگردوں نے پایا اسے انھیں کا دل محسوس کر سکتا ہے۔ مرحوم صوفیانہ وضع کے پابند تھے اور علمائے سلف کا صحیح نمونہ۔ انھوں نے دولت، امارت، حکومت اور شوکت سے مرعوب ہو کر کبھی علم کی توہین نہیں کی۔ مولانا کے متعلق یہ بات عام طور پر مشہور تھی کہ بغیر کسی پس و پیش و تردد کے اپنے خیال اور رائے کا ہر موقع پر اظہار کر سکتے تھے۔ لوگوں کو مولانا سے جو جو فیض پہنچے ان کی داستاں تو بڑی طویل ہے۔ لیکن یہ سچ ہے کہ مولانا کی وفات سے ہم میں جو کمی ہوگئی اس کے پورا ہونے کی مستقبل قریب میں کوئی امید نظر نہیں آتی۔

خداوندا بیا مرز آں شہید امتحانے را''

یہ جو دوانے سے دو چار نظر آتے ہیں ان میں بھی کچھ صاحب اسرار نظر آتے ہیں

ایسے ہی دیوانوں میں ہمارے معاصر دوست جناب ظہور الدین امرتسری کا شمار ہوتا ہے۔ وہ تاریخ برعظیم کا کتابی ذوق رکھتے ہیں۔ کتاب سے محبت ان کی ذاتی علامتوں میں سے پہلی علامت ہے۔ مولانا سلیمان اشرف سے ان کو گہری قلبی وابستگی ہے۔ یہ مولانا سلیمان کی ''روحانی

جلالت'' ہی کہیے کہ اپنے روحانی استاد کی طرح ان کا مسلک بھی صلح کل ہے۔ وہ اپنے مسلک پر سختی سے کار بند رہنے کے باوجود دوسرے مسالک کے اہل علم سے دوستانہ مراسم رکھتے ہیں، جن میں یہ خاکسار بھی شامل ہے۔

ظہور امرتسری صاحب نے اپنے وسیع المشربی کے باوجود اپنے مسلک کی بذریعہ قلم و قرطاس جیسی خدمات انجام دیں وہ قابل قدر ہے۔ مولانا سلیمان اشرف کی کتابوں کی از سرنو طباعت کر کے انھوں نے مولانا کو ایک نئی علمی زندگی دی ہے۔ اگر یہ کتابیں وہ شائع نہ کرتے تو مولانا سلیمان کا نام تو یقیناً زندہ رہتا مگر ان کے کام سے لوگ واقف نہ ہو پاتے۔

برعظیم میں ان کے مسلک کے نمائندہ علما کی تاریخ وسوانح اور ان کی مساعیٔ حسنہ کی جستجو ظہور امرتسری صاحب کا خاص موضوع ہے۔ اس سلسلے میں ان کی دیوانگی اپنے طبقے کے اہل علم کی فرزانگی پر فضیلت رکھتی ہے۔

بایں ہمہ، ''الخطاب'' کی نقل کے ساتھ یہ چند صفحات میں نے ان کی خواہش پر تحریر کیے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ ان کے نیک جذبات کا بہتر صلہ عطا فرمائے اور وہی بہتر اجر دینے والا ہے۔

والسلام مع الاکرام

محمد تنزیل الصدیقی الحسینی

۷/اکتوبر ۲۰۱۳ء

کراچی

آتیناہ الحکمۃ وفصل

الخطاب

تقریر فقیر محمد سلیمان اشرف

بموقع اجلاس بست وہشتم کانفرنس

منعقدہ راولپنڈی

باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی

مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ

۱۹۱۵ء

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

خطبہ مسنونہ و صلوٰۃ تحنا و تعوذ و تسمیہ کے بعد یہ آیت کریمہ تلاوت کی گئی۔ هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۭ

بشارتِ فتح مبین یہ آیۂ کریمہ آخر رکوع سورۂ فتح کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کی ایک جماعت ہے جو حبیب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی میں سعادتِ کونین کی دولت لوٹتی ہوئی مدینہ طیبہ واپس جا رہی ہے۔ بغرض عمرہ رسول کریم علیہ الوف الصلوٰۃ والتسلیم چودہ سو مسلمانوں کو لیکر عازم مکہ معظمہ ہوئے تھے۔ کفار مزاحم ہوئے اور حدیبیہ سے آگے بڑھنا نہ ہوا۔ یہ تمام واقعہ طویل ہے۔ مختصراً یوں سمجھیئے کہ ایک صلح نامہ لکھا گیا جس کے شرائط مسلمانوں پر شاق تھے۔ لیکن سرکار دو عالم کی متابعت اسی میں تھی لہٰذا بسر و چشم منظور تھا۔ مگر اس طرح کی مراجعت نے دلوں کو اس کیفیت کو جس میں ایک سوزش اس سوزش میں اخلاص اس اخلاص میں عبودیت کامل موجود تھی ذرا چمکا دیا تھا۔ اس پر منافقین کے استہزا و طعن و تشنیع اور بھی نمک چھڑکتے جاتے تھے۔ پس کمال نیاز مندی انتہائے تذلل و انکسار سے قلوب مومنین

اپنے اُس قادر قیوم کے جناب میں جس کی ہستی و یکتائی کا کلمہ پڑھ چکے تھے ملتجی[1] تھے کہ خداوندا اپنے اس سچے دین کو غلبہ عطا فرما اور کفر و شرک سے اپنے اُس بیت معظم و مکرم کو جس کی بنیاد تیرے خلیل نے اپنے ہاتھوں سے ڈالی تھی پاک فرما۔ یہ اُن سوختہ[2] دلوں کی آرزوئیں تھیں جنہیں جینا اور مرنا خدا کے لیے سکھلایا گیا تھا۔

جن کی نگاہوں نے وہ کچھ دیکھ لیا تھا جس کے دیکھنے کے بعد تمام فانی زینتیں اور منعدم ہونیوالی لذتیں ہیچ ہو جاتی ہیں۔ اب اُن کی نگاہوں کے آگے جو کچھ تھا سو ایمان و اسلام تھا۔ اسی کی عزت عزت تھی، اُسی کی زینت زینت اُسی کا بقا بقا، دیگر ہیچ۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ رحمت رحمٰن و رحیم اُن کی تمناؤں کو لبیک نہ کہتی۔ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ[3] (یعنی ہم دعا مانگنے والے کی دعا کو قبول کرتے ہیں) کا ظہور نہ ہوتا۔ دریائے رحمت الٰہی موجزن ہوا۔ غبارِ ملال خاطر[4] آشفتگاں[5] سے دُھلنے لگا، مجروح دلوں پر مرہم کافور رکھا جانے لگا۔ ہنوز مدینہ طیبہ پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ جبرئیل امین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے اور یہ مژدۂ جانفزا اور کلام روح پرور سنایا۔ "اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا[6]" اے میرے حبیب کھلی اور روشن فتح کا تجھے مالک بنا دیا نعمائے الٰہی کا ہر طرح تجھ پر اتمام ہوا۔ ذرا الفاظ قرآنی کی طرف غور فرمائیے کہ کیسے زوردار لفظوں میں یہ خوشخبری پہنچائی گئی۔ پھر یہ بھی غور کرو کہ فتح کی صفت مبین فرمائی یعنی روشن اور واضح تاکہ دوست دشمن موافق و مخالف سبھی جان لیں کہ سرتاج رسل صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح حاصل ہوئی، اور لفظ فتح کو نکرہ[7] لایا تاکہ ہر طرح کی فتح بالعموم رسول کی ملکیت سمجھی جائے۔ علمی، اخلاقی، صنعتی، سیاسی دینی وغیرہ۔ اللہ اللہ ایک وہ نفوس قدسیہ کی جماعت تھی جن کے غبار خاطر کو اس طرح رب العزة نے دور فرمایا۔ ایک ہم بھی کلمہ گو ہیں کہ جن کے دل سے صدق و صفا ایسا ہی سلب ہو گیا ہی جیسا صحابہ کے قلوب سے معصیت و عصیان۔ پھر جو کچھ ہوا وہ اسی اخلاص کا نتیجہ تھا، اور جو کچھ اب ہو رہا ہے یہ ہمارے افعال زشت[8] کا ثمرہ ہے۔

چوں برآری از میانِ جاں خروش　　اندر آید بحرِ بخشایش بہ جوش
تانہ گرید ابر کے خندد چمن　　تانہ گرید طفل کے جوشد لبن[9]

بہرحال یہ اللہ کا وعدہ تھا جس کا ایک ایک حرف اُن مخلص نیازمندوں کے حق میں صادق ہو کر رہا جنہوں نے رضائے الٰہی کے لیے اپنی ہستی، اپنے جذبات، اپنی تمنائیں سب کی سب گم کر دیں اور پھر وہ سب کچھ پایا جو پانے کے قابل تھا۔ اَللّٰهُمَّ ارْضَ عَنَّا بِحُرْمَتِهِمْ[10] اس آیہ کریمہ کے مضامین کے متعلق

[1] ملتجی۔ التجا کرنے والا، درخواست کرنے والا، متمنی، آرزومند، مستدعی (۲) منت سماجت کرنے والا، عاجزی کرنے والا (۳) پناہ ڈھونڈنے والا
[2] سوختہ۔ جلا ہوا (۲) سنجیدہ، موزوں [3] البقرہ: ۱۸۶ [4] غبار خاطر۔ رنجش، ملال خاطر، طبیعت کی کدورت (۲) طبیعت کا اکتا جانا۔
[5] آشفتگان (آشفتہ کی جمع) پریشان، سراسیمہ، پراگندہ، بدحواس (۲) دیوانہ (۳) حیران [6] الفتح: ۱ [7] نکرہ۔ ناشناس (۲) ناآشنا (۳) معرفہ کی ضد، اسم عام [8] زشت۔ برا، خراب، مذموم، بھونڈا، بدنما، بدشکل [9] (مثنوی معنوی۔ رومی) "جب تجھ سے دل سے نالہ و فریاد کرتے ہو تو بخشائش کا سمندر جوش میں آتا ہے، جب تک بادل روئے نہیں، چمن کہاں ہنستا ہے؟ جب تک بچہ نہیں روتا، دودھ کہاں چھوٹتا ہے۔" [10] "اے اللہ تعالیٰ اُن کی حرمت (وقار و تکریم) کے صدقے میں ہم سے راضی ہو جا۔"

ایک مختصر تمہید تھی جس میں اس سورۂ مبارکہ کا شانِ نزول بھی مذکور تھا۔ اس سے یہ بات معلوم ہو گئی ہوگی کہ انسانی کامیابی کا کیا راز ہے اور کامیاب زندگی کے کیا معنی ہیں۔ لیکن مختلف طبقات کے اشخاص کا خیال کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کسی قدر واضح تفسیر اس آیۂ شریفہ کی کی جائے۔

حضرت ربّ العزت جلّ جلالہٗ نے اس آیۂ کریمہ میں اپنی توحید و الوہیت اور نبوۃ و رسالت کی دلائل قاہرہ بیان کرتے ہوئے اس دینِ الٰہی کے متعلق جس کی ابتدا حضرت آدم سے اور انتہا حضرت خاتم النبیین سے ہوئی حالت بیان فرماتا ہے۔ اس کے بعد ان خوش نصیبوں کا ذکر اور ان کے حالات جمیلہ کی مدح فرماتا ہے جنہوں نے نہایت استقامت سے اس دینِ الٰہی کو لبیک کہا تھا۔ مبارک ہیں وہ بندے جو مصداق اس آیۂ کریمہ کے ہوئے اور قابلِ تقلید ہے وہ حالت جس کی مدح سرائی کلامِ الٰہی میں ہوئی۔ وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ[1] (ریس کرنے والوں کو اس امر میں ریس کرنا چاہیے۔) آیۂ کریمہ کے حصۂ اولیٰ (توحید و الوہیت) کے سمجھنے کے لیے ایک مختصر مقدمہ کی ضرورت ہے پہلے اس پر اچھی طرح غور فرمالیں۔

فلسفۂ عملی و فلسفۂ نظری

حضرات! عالم میں جس قدر چیزیں کہ پائی جاتی ہیں خواہ جوہر ہوں یا عرض وہ دو حال سے خالی نہیں بعض تو ایسی ہیں جن کا وجود ہماری قدرت و اختیار میں ہے جیسے علم صدق دیانت وغیرہ وغیرہ۔ اور بعض ایسی ہیں جن کا وجود ہماری قدرت و اختیار میں نہیں جیسے آفتاب زمین ضوءِ شمس و قمر وغیرہ وغیرہ۔ پہلے قسم کے علم کو فلسفۂ عمل اور دوسرے قسم کے علم کو فلسفۂ نظر کہتے ہیں۔ پہلے قسم کو فلسفۂ عمل اس لیے کہتے ہیں کہ وہاں مجرد[2] علم کمالِ نفسانی کے لیے کافی نہیں ہوتا ہے بلکہ اس پر عمل[3] ہونا بھی شرط ہے۔ مثلاً ایک شخص اتفاق کے معنی جانتا ہے اور اس کے فوائد کا بھی اسے علم ہے لیکن اس پر عمل آرا نہیں ہوتا تو عمر بھر اسے وہ فوائد حاصل نہ ہونگے جو اتفاق سے وابستہ ہیں اور یہ علم قطعاً اس کے نفس کو مہذب نہ بنائیگا۔ پس حکمتِ عملی[4] کے لیے ضرور ہے کہ اولاً اچھی باتوں کا علم حاصل کیا جائے اور بعد علم کے اس پر عمل کی عادت ڈالی جائے تاکہ نفس اعلیٰ و پاکیزہ عادتوں پر ملکہ ہو جائے۔ رہا فلسفۂ نظر سو یہاں صرف علم موجبِ کمالِ نفس ہوتا ہے یعنی ایسے موجودات[5] جن کا وجود ہماری قدرت و اختیار میں نہیں ہے۔ ان کے حقائق کا علمی قدر طاقتِ بشری جاننا کمالِ نفس کے لیے کفایت کرتا ہے۔ آج دنیا میں انہیں حقائق کے اکتشافات[6] کا نتیجہ جو محیر العقول کرشمے تم دیکھ رہے ہو۔ فَسُبْحَانَ الَّذِیْ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ[7] (پس پاک ہے وہ ذات جس نے انسان کو وہ باتیں سکھلا دیں جنہیں وہ نہ جانتا تھا۔)

[1] المطففین: ۲۶ [2] مجرد۔ اکیلا، تنہا (۲) وہ شے جو مادہ سے پاک ہو، جیسے روح، فرشتہ [3] عمل۔ عمل پیرا، اس راستے چلا ہوا [4] حکمتِ عملی۔ پالیسی، کام کرنے کی حکمت، دوراندیشی [5] موجودات (موجود کی جمع) مخلوقات، دنیا، کائنات، وہ تمام چیزیں، جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں، نیچر [6] اکتشافات (اکتشاف کی جمع) دریافت (۲) کھلنا، ظاہر ہونا [7] قولہ تعالیٰ: عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (علق: ۵)

۴

بعد اس کے کہ فلسفہ سن و فلسفہ نظر کی تعریف و غایت[1] معلوم ہو چکی میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ جس نے اپنے آپ کو فلسفۂ عمل سے متصف[2] کیا ہوگا کیا اُس کی نظر سے یہ بات پوشیدہ رہ سکتی ہی کہ جس نے اس شئے کو پیدا کیا اور ان صفات و اخلاق سے نفس کو متصف کرنے کی ہدایت فرمائی بیشک وہ ایک بڑا حکیم و علیم ہی۔ ہاں یہ امر بھی یہاں پر سمجھ لینے کے قابل ہی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں جسقدر جذبات و قوتیں کہ ودیعت فرمائی ہیں ان میں سے ہر ایک ضروری و انتہائی درجے کی مفید ہے۔ اُن کا بیجا استعمال بے محل صَرف البتہ اُنھیں مذموم بنا دیتا ہی۔ مثلاً ایک جذبہ غیرت ہی کہ جب تک اس جذبہ کو اُس صحیح دائرہ تک رکھیئے محمود ہی لیکن افراط کے مرتبہ میں پہنچکر غضب و جنوں کہا جاتا ہی اور تفریط میں آکر بے غیرتی و بے حمیتی۔ جسقدر غور کرینگے اسی قدر یہ مسئلہ واضح ہوتا جائیگا کہ افراط و تفریط سے اگر کام نہ لیا جائے تو پھر انسان میں کوئی جذبہ و قوۃ مذموم نہیں اور جذبات کو اعتدال پر قایم رکھنا اصل کمال انسانی ہی۔ اب کیا وہ شخص جسکی زندگی کا دستور العمل[3] فلسفۂ عمل ہو کیا اس امر کا اعتراف نہ کریگا کہ جس نے ان جذبات و قوتوں کو پیدا کیا وہ ایک عجیب بے مثل ذات ہی اور اُس کی حکمت کی حقیقت تک پہنچنے سے انسان عاجز ہی۔ اسی طرح جس نے کائنات کے صحائف[4] کا مطالعہ کیا ہوگا اور جمادیات[5] حیوانات[6] ان میں سے کسی کی صنعت کی طرف غور و فکر سے کام لیا ہوگا تو قدرت کے عجائبات نے اُس کی عقل کو متحیر فکر کو مشتبہ بنا دیا ہوگا۔ اور بیساختہ اُس کے منہ سے یہ نکل گیا ہوگا۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ ۝

مشاہدۂ اشیاء سے سبق

صبح کے وقت کسی چمن میں جاؤ وہاں کا سماں دیکھو سبزوں کا لہلہانا غنچوں کا شگفتہ ہونا مختلف پھولوں میں مختلف رنگ و بو کا پایا جانا کیا یہ سب تمھیں اس طرف رہبری نہ کرینگے کہ عالم کا کوئی صانع ہی۔ ایک گلاب کا پھول لیلو۔ اُس کی نزاکت اُس کی بابت اُس کی رنگت، اُس کی پنکھڑیاں اُن پنکھڑیوں کے ریشے کیا اپنے خالق کا پتہ نہیں دیتے ہیں یا اُس کے کمال صنعت کو اپنے وجود سے ثابت نہیں کرتے صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کی کاریگری ہی جس نے ہر چیز کو مستحکم بنایا ہی کیا کسی نے آج تک ایک پھول بھی ایسا بنایا جو ان تمام صفات ظاہری و باطنی میں گلاب کے مانند ہو اور اسی طرح اپنے آپ میں روح نباتی بھی رکھتا ہو۔ ہرگز نہیں۔ اطبا سے پوچھو تو تمھیں معلوم ہو کہ گلاب اپنے رنگ و بو حسن و جمال کے علاوہ کیا کیا خواص رکھتا ہی۔ کتنے امراض میں کام آتا ہی اور کس کس طرح بہترین ادویات کا جز بنکر صحت و راحت انسانی کا سبب ہوتا ہی۔ کسی ٹیلے سے بہتے

---

۱ غایت۔ انتہا، غرض، مطلب (۲) آخر، انجام ۲ متصف۔ صفت کیا ہوا (۲) تعریف کیا گیا، موصوف جس کے ساتھ کوئی وصف لگا ہو۔
۳ دستور العمل۔ قاعدہ (۲) قانون جس کے مطابق چلنا چاہیے (۳) ہدایت نامہ (۴) کام کا طریقہ ۴ صحائف (صحیفہ کی جمع) کتابیں (۲) لکھے ہوئے صفحات، اوراق ۵ جمادیات (جمادات۔ جماد کی جمع) بے جان چیزیں جن میں حس و حرکت اور نشو و نما کی قوت نہیں، جیسے دھات پتھر مٹی وغیرہ ۶ حیوانات (حیوان کی جمع) زندہ جاندار (۲) زندہ ہونا

فلسفی سے التجا کر دیا کسی ماہر علم نبات سے التماس لاؤ کہ ایک پھول ہی ایسا بنائے جس میں گلاب جیسے اوصاف پائے جائیں۔ اچھا اگر تمام عمر کی کوشش سے ایک پھول اُس نے بنا بھی لیا تو یہ خواص اُس میں پیدا نہ ہونگے۔ اور بفرضِ محال اگر اُس میں خواص کچھ مان بھی لیے جائیں تو اُس کے استعمال میں یہ تنوعاتِ مفیدہ نہ پائے جائینگے۔ اور سب کچھ سہی مگر وہ حیاتِ نباتی جو اپنے آپ میں ایک گلاب کا پھول رکھتا ہے وہ کہاں سے پیدا ہوگی۔ ایک طرف ماہرانِ فن کا یہ عجز دوسری طرف اُس قادر وقیوم کی قدرت کا یہ جلوہ کہ ہر صبح کو کروڑوں پھول اُسی آب و تاب اُسی خواص و طبائع کے ساتھ چمنستانِ عالم میں شگفتہ ہو کر اپنے خالق کی تسبیح و تقدیس زبانِ حال سے کرتے ہوئے کچھ دیر اپنی بہار دکھا کر کل کے آنیوالوں کے لیے جگہ خالی کر دیتے ہیں۔ اور ایک غیر محسوس طرز پر اُسی کے پاس چلے جاتے ہیں جس نے انھیں یہاں چند ساعتوں کے لیے بارونق بنا کر بھیجا تھا۔ فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهِ مَلَكُوتُ كُلِّ شَيْءٍ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۞ (پاک ہے وہ ذات جس کے قبضہ قدرت میں ہر چیز کی بادشاہی ہے اور تمام اشیا اُسی کی طرف لوٹتی جاتی ہیں)

اسی طرح ایک علم الابدان کے ماہر کو لو اور اُس سے پوچھ دیکھو کہ تشریحاتِ اعضائے انسانی میں اُس کی عقل و ادراک کا مشاہدہ کرتے ہوئے کیسی متحیر رہ جاتی ہے۔ ایک ایک عضو اپنی صورت و لحاظ سے اپنے خواص اپنے افعال اور اپنے محل وقوع کس حکمت سے مخلوق کی گئی ہے۔ مثلاً آنکھ کی پہلی ساخت کی طرف غور کرو اُس کی نزاکت کو دیکھو پھر اُس کے محل وقوع پر نظر ڈالو پھر قدرت نے جو اُس کے محفوظ رہنے کی تدابیر عمل میں لائی ہیں اُسے سوچو اُس کے بعد دیکھنے کے فلسفے پر فکر دوڑاؤ اور اس دیکھنے کے لیے خالق نے آنکھ میں کیا کیا شکل کے پردے بنائے ہیں اُسے مطالعہ کرو پھر تم خود ہی کہہ اُٹھو گے کہ سراپا حکمتوں سے مرصع وجود محض امتدادِ دہر یا اتفاقاتِ ایام یا تنوعاتِ حرکت کا نتیجہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ ترتیب و یہ نظام کسی بڑی قدرت والے ذی اختیار کا کام ہے بیشک ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۞

قرآن اور فلسفہ علمی و نظری

حضرات! اس بیان سے مقصود یہ ہے کہ میں آپ کے سامنے اُس کتاب آسمانی کی عظمت جسے ہمارے پیغمبر روحی فداہ ہم میں امانت فرما گئے ہیں ظاہر کروں۔ دیکھیے فلسفہ نظر کا جاننے والا مرتبے میں فلسفہ عمل کے عالم سے اعلیٰ سمجھا جاتا ہے اور یہ امر مسلم ہے کہ فلسفہ نظر میں جو حصہ کہ سب سے اہم ترین معرکتہ الآرا ہے وہ فلسفہ الٰہی ہے تو اب مجھے یہ بتلانا ہے کہ جس طرح سے کتاب اللہ نے فلسفہ عمل میں ہمیں تمام فلاسفہ کی تصانیف سے بے نیاز کر دیا ہے اُسی طرح فلسفہ نظر کی

---

۱ تنوعات (تنوع کی جمع) طرح طرح کا ہونا، قسم بہ قسم ہونا، گونا گونی ۲ الملک: ۸۳ ،۲۸ تری ۳ غالباً یہ لفظ لو ادراک (؟) ہے۔ ۴ مرصع۔ آراستہ ۵ امتداد۔ زمانہ، مدت، مدت گزرنا، درازی (۲) دراز اور کشیدہ ہونا ۶ الانعام: ۹۶، یٰس: ۳۸، حٰم السجدہ: ۱۲ میں یوں ارشاد ہوتا ہے۔ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۞ ۷ فلسفہ۔ لاطینی، علم حکمت، دانائی (۲) فیلسوف یعنی حکیم ودانش مند ہونا (۳) علم اشیائے موجودات مع علت و اسباب ۸ [illegible] سفہ (فلسفی کی جمع) حکما، دانش مند لوگ

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۷)

حصۂ الٰہیات[۱] میں ہم کسی کے محتاج و مستند[۲] نہیں ہیں۔ فلسفہ الٰہی کا بڑے سے بڑا عالم جہاں تک پہنچا ہے یا پہنچیگا آج سے چودہ سو برس قبل ہمیں فرقان حمید وہاں تک پہنچا چکا ہے۔ اس کو ذرا واضح طور پر یوں سمجھیے کہ وجود باری پر حکمائے جو دلائل کہ قایم کیئے ہیں وہ تین نوعیتوں میں منحصر ہیں۔ امکان[۳]، حدوث[۴]، اور نظام و ترتیب۔ یعنی جواہر[۵] و اعراض[۶] کا ممکن ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ ان کے وجود کا راجح[۷] کرنیوالا کوئی ہے اور وہ خود دائرۂ امکان سے خارج ہے، ورنہ دور و تسلسل لازم آئیگا اسی طرح جواہر[۸] و اعراض[۹] کے تغیر سے اُن کے حدوث[۱۰] پر دلیل لاتے ہیں اور یہ طے شدہ امر ہے کہ ہر حادث کیلیے ایک محدث[۱۱] چاہیئے جو خود حادث نہو بلکہ قدیم ہو ورنہ وہی خرابی دور و تسلسل کی یہاں بھی لازم آئیگی۔ تیسرا طریقہ نظام عالم سے استدلال کرنے کا ہے۔ حکما اس کی تقریر یوں کرتے ہیں کہ تمام جسم خواہ فلکی[۱۲] ہوں یا عنصری[۱۳] جسم و لوازم جسم میں یکساں ہیں۔ پھر اُن کا باعتبار صفات و اشکال و مقادیر و امکنہ[۱۴] و احیاز[۱۵] مختلف ہونا کس سبب سے ہے۔ جسم اور اس کے لوازم کو تو کہا جا نہیں سکتا۔ اس لیے کہ جسم میں حیثیت جسم اور لوازم جسم بہ حیثیت لوازم جسم کا اقتضا[۱۶] یکساں ہے۔ یہ اتفاق کو چاہیگا نہ کہ اختلاف کو پھر اب جو اختلاف پایا جاتا ہے تو وہ کسی امر منفصل[۱۷] کے جہت سے ہے۔ جو نہ جسم ہے نہ اس سے متعلق ہے پھر وہ مجبور بھی نہیں ہو سکتا اس لیے کہ مجبور تو مجبور ہی ہے اُس سے صدور افعال کیونکر ہوگا۔ لا محالہ قادر و مختار ہے۔ پس وہ ذات جو قادر و مختار ہے اور جسم و جسمانیت سے پاک ہے اُس کا وجود ضروری ہے تاکہ اجسام کے مختلف صور و صفات وغیرہ وغیرہ سے نظام عالم قایم رہے اور وہی اللہ ہے۔ یہ منطقی پر پیچ تقریر کوئی سمجھا ہوگا اور کوئی اُلجھ کر رہ گیا ہوگا کہ یہ کیا بکواس و چیستاں[۱۸] ہے اور جس نے سمجھا بھی ہوگا تو اُس کے قلب کو سکون پیدا ہوا ہو یا نہوا ہو۔ اب آئیے اس طرف۔ ہم آپ کو یہ دکھلائیں کہ قرآن پاک کس طرح ہمیں اس اہم مسئلہ کو سمجھاتا ہے۔ اَللّٰہُ الْغَنِیُّ[۱۹] وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ۔ بے نیاز ذات اللہ تعالیٰ کی ہے اور تم سب کے سب محتاج ہو۔ ذرا اسی آیہ پر غور کرلو یہ ہر شخص جانتا ہے کہ انسان سراپا احتیاج و مجسمۂ حاجت ہے۔ اب یہ اپنی حاجتوں کو رفع کرنے کے لیے جس کی طرف رجوع کرتا ہے وہ سب مخلوقات الٰہی ہیں۔ اور وہ بھی اپنے وجود کے بقا اور حفظ تشخص میں کسی کی طرف محتاج ہیں۔ دیکھو یہ وہی امکان کا مسئلہ ہے مگر حکمار کے یہاں وہ دور و تسلسل کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور قرآن نے ایک دلکش جملہ[۲۰] اَللّٰہُ الْغَنِیُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ فرما کر ہمارے امکان ہمارے تغیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنا قدیم و قادر ہونا بھی ثابت کردیا اور یہ بھی بتلا دیا کہ احتیاج و درماندگی میں تمھارا اصل مرجع[۲۱] کون ہونا چاہیئے

۱ الٰہیات۔ علم الٰہی مطابق فلسفہ، حکمت، علم الٰہی جو علم حکمت کی ایک قسم ہے (۲) علم الٰہی کے مسائل ۲ مستند۔ حاجت مند (۲) حاجت

۳ امکان۔ ہو سکنا، ممکن ہونا (۲) کسی شے کے عدم و وجود دونوں کا ضروری نہ ہونا (۳) قدرت، طاقت، مجال، مقدرت، مقدور (۴) قادر کرنا، اختیار، قابو، مرتبہ دینا (۵) قدم کے برعکس، عالم فانی، ناپائدار دنیا ۴ حدوث۔ عدم سے وجود میں آنا، نیا پیدا ہونا (قدیم کی ضد)

۵ جواہر (جوہر کی جمع) بر قیمتی/بیش قیمت پتھر مثلاً یاقوت، ہیرا، لعل، گوہر وغیرہ (۲) ہر چیز کی اصل، ہر چیز کا خلاصہ، کسی چیز کی وہ صفت جو اس کے ساتھ

قرآن کا طرزِ استدلال

حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا قصہ قرآن پاک میں موجود ہے۔ آپ نے چار مرتبہ مناظرہ فرمایا۔ پہلا مباحثہ بظاہر اپنے نفس سے تھا اور حقیقت میں قوم مخاطب تھی۔ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے۔[1] فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (جب کہ رات کی تاریکی نے چھپا لیا اور ستارے درخشاں ہوئے تو اُس نے کہا کہ یہ میرا رب ہے لیکن جب کہ وہ غروب ہو گیا تو اُس نے کہا کہ میں غروب ہو جانے والے کو پسند نہیں کرتا) دوسرا مباحثہ اپنے باپ سے فرماتے ہیں۔[2] يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا (اے باپ جو چیز نہ دیکھ سکے نہ سن سکے نہ تجھے کچھ بھی کسی سے بے نیاز کر سکے اُس کی عبادت کیوں کرتا ہے) پہلے مباحثہ میں حدوث و تغیر سے صانع عالم پر استدلال کرتے ہیں۔ دوسرے میں معبودی باطل معبودوں کی ظاہر فرما کر اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ معبود کو قادرِ مطلق ہونا چاہیے۔ تیسرا مباحثہ قوم سے ہے۔[3] مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْۤ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (یہ مورتیں جنکی پرستش پر تم جمے بیٹھے ہو یہ ہیں کیا چیز؟) یہاں یہ بحث پیش کرتے ہیں کہ مخلوق کسی حال میں معبود نہیں ہو سکتا۔ معبود کسی کے بنانے سے نہیں بنتا بلکہ معبود تو وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا۔ اور ان تمام چیزوں کو نیست سے ہست بنا دیا۔ چوتھا مباحثہ نمرود سے ہے۔[4] اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (جب ابراہیم نے نمرود سے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے۔ تو اُس نے کہا میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ تب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب مشرق سے آفتاب کو طلوع کرتا ہے تو اسے مغرب سے نکال دے پس کافر حیران رہ گیا۔ اللہ ظالموں کی ہدایت نہیں کرتا) یہ دلیل نظام[5] و ترتیب[6] عالم سے ہے۔ ابراہیم خلیل اللہ کی زبان سے جن دلائل کو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے اُن کی سادگی کو دیکھو۔ پھر اس کو خیال کرو کہ کس طرح دل میں گھر کر جانے والے استدلالات[7] ہیں۔ پس میرا یہ کہنا کہ حکمائے دہر کی عقلیں انتہائے کار میں جہاں پہنچیں اور اُن کے فکر کی جو آخری منزل ہوئی۔ وہ اُن کے لیے اگرچہ جتنا بھی مایہ ناز و فخر ہوا ہو۔ لیکن ہمیں آج سے ساڑھے تیرہ سو برس قبل ایک نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے دو سوکھے پہاڑوں میں دلق افروز ہو کر یہ سب کچھ پڑھا دیا۔ اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی ھٰذَا النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ[8]

حامیانِ علوم عقلیہ کا ایک مغالطہ

اس اس قدر اور بھی گزارش کرونگا کہ جہاں کہیں بھی الہیات کا باب

---

[1] الانعام:٧٦ [2] مریم:٤٢ [3] الانبیاء:٥٢ [4] البقرۃ:٢٥٨

[5] نظام۔ سلسلہ، ترتیب (٢) بندوبست، انتظام (٣) رسم، عادت (٤) جڑ، بنیاد [6] ترتیب۔ ہر چیز کو اس کے ٹھکانے اور مناسب موقع پر رکھنا، موزوں جگہ پر رکھنا، درجہ بدرجہ ٹھیک رکھنا/کرنا، درستی، آراستگی [7] استدلالات (استدلال کی جمع) دلائل، براہین، دلائل یا اسناد لانا (٢) دلائل چاہنا/طلب کرنا (٣) دلائل قائم کرنا (٤) گواہی دینا۔ [8] "اے ہمارے معبود اس نبی امی پر درود و سلام اور برکتیں نازل فرما۔"

ہیں حکما کی رائیں راستی کی طرف گئی ہیں وہ شمع نبوۃ کے نور ہی کا جلوہ ہے۔ نبیوں کے مُنھ کی نکلی ہوئی باتیں جب ان حکما تک پہنچیں تو اُس کی مقاومت[1] کی طاقت اپنے میں نہ پاکر انھیں باتوں کو اپنے الفاظ کے قالب میں ڈھال لیا۔ چند رعب اور مصطلح[2] الفاظ کی ثقالت[3] سے اُسے پرپیچ بنا کر اپنا کہکر لوگوں کے سامنے لے آئے۔ اب جو کوئی اُس کو پڑھتا ہے اُن کے کمالِ عقل وفکر رسا ہونے کا قائل ہو کر اُن کے قول کی عظمت کرنے لگتا ہے۔ اس طرح اُن کی وہ تمام باتیں جو اُن کی اختراعیات[4] ہوتی ہیں اور اُن کے مظنونات[5] وقیاسات کا صرف ایک انبار ہوتے ہیں وہ سب کو صحیح جاننے لگتا ہے۔ یہ پہلا مغالطہ ہے جو حامیان علوم عقلیہ کو پیش آتا ہے۔ اور جب تک اس غلطی کا ازالہ نہیں ہوتا اور اُن کے قدم اپنے دائرہ وحدود کے اندر نہیں آتے اُس وقت تک ہمیشہ ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ جب علوم کی اساس ہی غلطی پر ہو تو پھر صحت نتیجہ کی امید ہی عبث ہے۔

خشتِ اول چون نہد معمار کج ٭ تا ثریا می رود دیوار کج۔[6]

دوستو! اس مسئلہ کا بیان ذرا واضح ہونا چاہیئے تاکہ اگر کوئی مسلمان کی اولاد اس غلطی میں مبتلا ہو تو اُسے تنبیہ ہو جائے۔ دیکھیئے جب ہم ایک مہندس[7] کے پاس بیٹھتے ہیں اور ریاضیات کے مسائل میں اسکی موشگافیاں اور پرپیچ اشکال میں اُس کے ذہن کی جودت[8] دیکھتے ہیں اور پھر نتائج صحت کیساتھ یقین دلانے والے ہوتے ہیں تو ہمارا دل اس کی عظمت وکمال کے سامنے جھک جاتا ہے اور اُس کے صحیح العقل وفکر رسا کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اب وہ اپنے حدود ومعلومات وتجربے سے قدم باہر نکالتا ہے اور مذہب کے میدان میں آتا ہے۔ یہاں آکر اپنی بیباکی سے کچھ کہتا ہے تو ہماری عقیدت سابقہ اس امر پر ہمیں مجبور کرتی ہے کہ اس ماہر کی تحقیق سے انکار نہ کیا جائے۔ جس کی عقل ایسی دوربین ہو کیا اس کی نظر سے ایسی جلی باتیں مخفی رہ سکتی ہیں؟ نہیں کبھی نہیں۔ بس یہی فیصلہ تمام اغلاط کا سنگ بنیاد ہو جاتا ہے۔ حالانکہ تھوڑے غور وفکر سے کام لیا جائے تو یہ مسئلہ نہایت ہی آسانی سے صحیح اصول پر فیصل ہو سکتا ہے یعنی ایک شخص جو ریاضی کا جاننے والا ہے وہ امراض کی تشخیص اور معالجہ کی تجویز میں جب کہ بالکل عاجز ہے اور اُس کی عقل نہ تو ایک محموم[9] کی تپ کی نوعیت متعین کر سکتی ہے اور نہ اُس کا علاج تجویز کر سکتی ہے تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ مذہب کے باب میں اس کی رائے ویسی ہی وقیع سمجھی جائے جیسی کہ علم ریاضی میں۔ نیز اگر کوئی بہت بڑا ریاضی داں اعلیٰ درجہ کا طبیب حاذق بھی ہو تو کیا تشخیص امراض وتجویز علاج کے وقت اُس سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ اپنی تشخیص وتجویز پر اُسی طرح قطعی دلائل قایم کریں جیسا کہ آپ علم ہندسہ کے متعلق کیا کرتے ہیں۔

[1] مقاومت۔ کسی کے مقابلے کو آمادہ ہو جانا، کسی سے برابری کرنا (۲) مقابلہ [2] مصطلح۔ اصطلاح کیا ہوا، اصطلاح، محاورہ [3] ثقالت۔ وزن، بوجھ، گرانی، بھاری پن [4] اختراعیات (اختراع کی جمع) نئی بات نکالنا/ پیدا کرنا، ایجاد کرنا، نئی چیز نکالنی/ بنانا (۲) پھٹنا، پھاڑنا (۳) جی سے جوڑنا [5] مظنونات (مظنون کی جمع) ظن (گمان) کیا گیا/ کیا ہوا (۲) مشکوک، مشتبہ، شکی [6] "جب کوئی معمار پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھتا ہے تو دیوار آسمان تک جائے پھر بھی ٹیڑھی ہی رہے گی۔" [7] مہندس۔ اشکال ہندسہ یا علم ہندسہ کا عالم، اقلیدس کا ماہر (۲) انجینئر

الغرض یہ امر بداہتاً[1] ثابت ہے کہ ہر وجود کا ثبوت ایک ہی نوعیت پر نہیں ہو سکتا ہے۔ نیز ایک فن کی مہارت سے دوسرے فن کا علم لازم نہیں آتا ؂

بوریا باف گرچہ بافندہ است
نبرندش بہ کارگاہ حریر[2]

فیثاغورث کی ایک حکایت

ایک واقعہ بطور مثال گزارش ہے۔ فیثاغورث جو ایک بڑا حکیم دورِ قدیم میں تسلیم کیا گیا ہے اور جس کی تحقیقات پر آج یورپ کی انتہائے فکر نے قرار پکڑا ہے (یعنی یہ کہ زمین آفتاب کے گرد گھومتی ہے) اس مسئلہ کی اہمیت اس کے ذہن کی حدت[3] کی کافی شہادت ہے۔ لیکن مذہب میں آکر ایسی فاش غلطی کرتا ہے کہ تمام فلسفہ یہاں دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔ یہ حکیم تناسخ[4] کا بھی قائل تھا۔ ایک دفعہ کوئی شخص ایک کتے کو مار رہا تھا اور کتا چیخ رہا تھا۔ فیثاغورث وہاں سے گذرا۔ اس نے اس شخص سے کہا کہ اس کتے پر میری وجہ سے رحم کرو۔ اس میں میرے ایک دوست کی روح نے جسم لیا ہے اور میں اسے پہچانتا ہوں۔ قابلِ غور ہے کہ اولاً تناسخ کا قائل ہونا۔ پھر ایک کتے میں اپنے دوست کی روح کا حلول[5] یقینی طور پر تسلیم کرنا اور اُسے اذعان[6] کے ساتھ پہچاننا اور اس بنا پر رحم کا خواہاں ہونا، کیا بچوں جیسی باتیں نہیں ہیں؟ ایسا زبردست حکیم اور اس طرح کی باتیں۔ اس سے عقلِ انسانی کی پرواز معلوم ہو جاتی ہے۔

لمعاتِ کلامِ ربانی

یہ مضامین جو مشتے نمونہ از خروارے بیان کیے گئے ان سے مقصود صرف اس قدر تھا کہ کلامِ ربانی کے لمعات[7] آج بھی فلسفہ جدید کے سامنے ویسے ہی درخشاں و نور افشاں ہیں جیسے کہ اب سے چودہ سو برس پہلے تاباں و ضیا افگن تھے ؂

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ[8]

بلکہ صحیح فلسفہ دانی کا نتیجہ توحید و الوہیت کا اعتراف ہے۔ اور قرآن مجید کے ساتھ دل بستگی و فریفتگی نہ کہ وجودِ باری کا انکار اور فہم و تلاوتِ کلام اللہ سے یکسوئی و بیزاری۔

اب العبد مجیب بغیر دلائل توحید و الوہیت کے ایک نظر اس آیہ کے لفظ هُوَ الَّذِي پر ڈالیے جو دو لفظ اپنی تمام براہین و دلائل کو اپنے آپ میں سمیٹے ہوئے ہے۔

۱؎ بداہتاً۔ بطور بداہت۔ فی البدیہہ بات کہنا (۲) بغیر سوچی ہوئی بات جو محتاجِ دلیل نہ ہو، کسی بات کا اچانک ظہور (۳) مرگی (۴) ارتجالاً یعنی بے سوچے بولنا
۲؎ "بوریا بننے والا بھی اگرچہ بننے والا ہے، لیکن اسے ریشم کے کارخانے میں تو نہیں لے جایا جاتا۔"
۳؎ حدت۔ تیزی، تندی (۲) طبیعت کی تیزی (۳) جوش، زور
۴؎ تناسخ۔ آواگون۔ ایک صورت سے دوسری صورت میں جانا، ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق روح کا ایک قالب سے نکل کر دوسرے قالب میں آنا۔ (۲) روح کا قالب بدلنا (۳) زمانہ بدلنا، زمانہ کا نوبت بہ نوبت گردش کرنا
۵؎ حلول۔ داخل ہونا، حلنا (۲) ایک شے کا دوسری میں اس طرح داخل ہو جانا کہ دونوں میں تمیز نہ ہو سکے۔ (۳) آواگون، تناسخ (۴) سمائی، اتر جانا
۶؎ اذعان۔ یقین کرنا، بھروسا کرنا، اعتبار کرنا (۲) اقرار کرنا (۳) اطاعت، حکم ماننا، فرمانبرداری کرنا
۷؎ لمعات (لمعہ/لمع کی جمع) روشنی، چمک، چمکارا، نور (۲) کرن، شعاع
۸؎ (سعدی/گلستان) "چمگادڑ کی سی آنکھوں والے کو اگر دن میں کچھ دکھائی نہ دے تو سورج کے چشمے کا کیا قصور۔"
۹؎ کشف الخفاء، رقم الحدیث ۲۱۵۷۔ دار الکتب العلمیہ، جلد ۲، ص ۱۵۶ / المقاصد الحسنہ: رقم الحدیث ۹۳۶ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ص ۳۲۰

اس ضمیر (ھو) نے کیا آپ کے دل کو روشن اور اس اسم موصول (الّذی) نے کس طرح آپ کو واصل اس مقام کا کر دیا جہاں تک پہونچنے کی تمنا عقلائے دہر کو فنا ہو جانے کے بعد بھی باقی رہی ؎

دل نگہدار از خیالِ غیرِ دوست
روز و شب از بہر او کن ہاؤ ہو [1]

اس سے زائد میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ مضامین بہت ہیں اور دل میں بہت کچھ کہنے کی آرزو ہے مگر کیا کیجئے افسوس ؎

مرے دردِ دل کے ترانے بہت ہیں
شبِ وصل کم ہے فسانے بہت ہیں

مسئلہ رسالت

اب بیانِ رسالت کا شروع ہوتا ہے۔ چھ سات لفظوں میں مسئلہ رسالت کا براہین و استدلال کے ساتھ بیان کر دینا تو خدا ہی کا کام ہے۔ میں اسقدر جامع ترجمہ کرنے سے مجبور ہوں۔ نہ تو اردو زبان میں اس طرح کثیر معنی کو سمیٹنے والے الفاظ ہیں اور نہ مجھے ایسی قدرت حاصل ہے پس لامحالہ اس کے ترجمہ و تفسیر سمجھانے میں مجھے آپکے وقت کا ایک کافی حصہ لینا ہوگا۔ اور امید کرتا ہوں کہ اخیر میں آپ بھی اپنی اس عطا سے ناراض نہ ہونگے۔

مسئلہ رسالت کو اچھی طرح ذہن نشین کرنیکے لیے پہلے اس مقدمہ کو سمجھیئے کہ اجل ترین[2] موجودات بالاتفاق بنی آدم ہے لیکن ایک عجیب لطف ہے کہ آدم کی اولاد جب کتم عدم سے حیز وجود میں آتی ہے تو ہر طرح کے وہ سامان لوازم جو حیات کے لیے یا اپنے ماسوا سے بہرہ مند ہونیکے لیے اسے چاہئیں ان میں سے ایک بھی اسکے پاس نہیں ہوتا۔ ہر شئے کے حصول کے لیے اسے ایک زمانہ اور مدتِ معینہ چاہیئے اور پھر یہ کہ قدم قدم پر ایک معلم کی تعلیم اسکی دستگیر ہو۔ برخلاف اسکے دیگر حیوان جو ہیچ انسان کے جسم میں مشارک[3] ہیں۔ وہ اپنے وجود کیساتھ تمام وہ سامان جو انھیں حر[4] و برد[5] سے محفوظ رکھے دشمن کے حملے سے بچا سکے اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ اپنی غذا کی تمیز انھیں پیدائش کیساتھ ہی ساتھ ہوتی ہے۔ ہر حیوان کو تم دیکھو گے کہ وہ اپنی غذا کو پہچانتا ہے۔ اپنے دشمن کو شناخت کرتا ہے۔ اپنے پر یا سرعتِ قدم کی مدد سے دشمن کی زد سے بھاگ سکتا ہے۔ یا پنجہ و دندان سے اپنی مدافعت کر سکتا ہے۔ غرض حیوان کو جو کچھ بھی ہونا ہے وہ سب یکبارگی ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ اسکی تمام تر ترقی صرف اس امر میں منحصر کہ وہ اپنی نوع کو قائم و باقی رکھے اس لیے اُسے صرف خزانۂ الٰہیہ سے اسقدر چیزیں جو دیگئیں اسی کے ساتھ عطا کر دیجاتی ہیں جنکا ہونا تحفظ وجود و بقائے نوع کے لیے ضروری تھا۔ مگر انسان جو اپنی پیدائش کیوقت سادہ محض ہوتا ہے اسکے وجود کا مقصد صرف یہی نہیں ہے کہ اپنے آپ یا اپنی نوع کو قائم و باقی رکھے بلکہ اسکی نہاد اس طرح کی بلند تر بنائی گئی ہے اسلیے وہ اس عالم میں بتدریج آہستہ آہستہ

---

۱ "محبوب کے غیر کے خیال سے دل کو محفوظ رکھو، شب و روز محبوب کے لیے گریہ وزاری کرتے رہو۔"
۲ اجل ترین موجودات۔ مخلوقات/کائنات میں بزرگ ترین یا نہایت بڑی شان والا ۳ مشارک۔ شریک ہونے والا، ساجھی
۴ حر۔ گرم ہونا (۲) گرمی ۵ برد۔ سرما، سردی (۲) جاڑے کا موسم (۳) سرد

ایک ایک چیز کا عالم ہوتا جاتا ہی اور یہی ترقی کی رفتار بلے سے لیکر تا لحد جاری رکھتا ہی جس انسان نے اپنے خلق کے اس راز کو سمجھا وہی تو حقیقتاً انسان رہا ورنہ اُس کا وجود صورتاً انسان اور حقیقتاً حیوان سے بدتر ہی اس مسئلہ کا کافی بیان تقریر آئندہ کے کسی حصہ میں آئیگا۔ اس وقت مجھے صرف مسئلہ تعلیم کی طرف آپ کو متوجہ کرنا ہی تاکہ صرف ضرورت رسالت اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔

احتیاج معلم

انسان میں پانچ حواس ظاہری (لامسہ۔ باصرہ۔ سامعہ۔ ذائقہ۔ شامہ) اور پانچ حواس باطنی (حس مشترک۔ وہم۔ خیال۔ حافظہ۔ متصرفہ) ودیعت رکھے گئے ہیں اور یہ حواس عشرہ کم و بیش سب میں پائے جاتے ہیں ہر حواس کا کام علیحدہ ہی اور ہر ایک کا ان میں سے ادراک جداگانہ۔ ایک حواس اگر ضائع ہوجائے تو دوسرا اُس کا قائم مقام ہوکر اُسکے کام کو انجام نہیں دے سکتا سب سے پہلے انسان میں حس لامسہ پیدا ہوتی ہی۔ جب یہ حواس کام کرنا شروع کردیتا ہی تو انسان کو اُس عالم کا علم ہونا شروع ہوجاتا ہی جس کا تعلق حس لامسہ سے ہی۔ اس کے بعد حس باصرہ پیدا ہوتی ہی اور اب ایک دوسرے عالم کا علم جو پہلے سے بہت زائد وسیع و دلفریب ہی اُس کے معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔ پھر حس سامعہ آپ میں پیدا ہوکر نغمات و اصوات کا عالم اُسے بتاتی ہی۔ اُس کے بعد حس ذائقہ اس کے بعد حس شامہ۔ الغرض پانچ حواس آہستہ آہستہ یکے بعد دیگر انسان میں پیدا ہوکر اُسے پانچ عالموں کا عالم بنا دیتے ہیں۔ اب جب کہ وہ تقریباً سات برس کا ہوتا ہی تو اُس میں ایک دوسرا حاسہ پیدا ہوتا ہے جسے تمیز کہتے ہیں۔ اور اب اِس قوت تمیز سے وہ اُن اشیا کا علم حاصل کرتا ہی جس کے بتلانے سے حواس بالکل عاجز تھے اس کے بعد ایک اور نیا حاسہ اُس میں پیدا ہوکر اُسے ایک اور ہی عالم میں پہنچاتا ہی اور اس کا نام عقل ہی۔

اب اس تمام مدت میں اگر انسان کو کوئی تحقیق والا معلم مل جائے اور علوم مفیدہ کا اُسے افاضہ کرے تو وہ ان نعمائے الٰہیہ کو جو حواس و تمیز و عقل کی صورت میں اُسے عطا کی گئی ہیں، ان کو ایسا کام میں لاتا ہی کہ خلقت انسانی کے بعض مقاصد ایک حد تک پورے ہوجاتے ہیں۔ اور اگر کوئی استاد نہ ملا اور اُسکی تعلیم صحیح اُصول پر نہوئی، تو تمام نعمتیں برباد ہوجاتی ہیں۔ اور ایک حیوانی زندگی اُس کی رہ جاتی ہی ایک بدیہی بات ہی۔ اور مشاہدات اس پر شاہد عادل کہ انسان اپنے تمام لوازمات زندگی و معاشرت میں کسی معلم کا محتاج ہی اور یہ کہ اچھی معاشرت و متمدن زندگی تعلیم ہی کا نتیجہ ہی۔ جنھیں تعلیم نصیب نہیں ہوئی، اُن کی زندگی پہاڑوں اور جنگلوں میں جاکر دیکھنی چاہیے۔ نہ مکان ہی نہ لباس۔ نہ کھانے کا طریقہ نہ رزق حاصل کرنیکے اصول

لہ حاسہ۔ محسوس/ادراک کرنے والی قوت، حس کرنے والی جیسے قوت سامعہ، باصرہ ۲ افاضہ۔ فیض (۲) فیض رسانی (۳) خبر پہنچانا، بات شروع کرنا ۳ نعما۔ نعمتیں، نعمت ۴ متمدن۔ مہذب (۲) بسنے والا

انھیں معلوم ہیں۔ غرضکہ جسقدر انسان میں دائرہ تعلیم و تعلّم کا وسیع ہوگا اُسی قدر وہ اپنے تمام حواس سے اُن سے مفید کام لے سکیگا۔ لیکن انسان کی ترقی اسی جگہ ختم نہیں ہو جاتی ہنوز ایک بڑا حصہ اُس کی زندگی کا ناتمام ہی اور اُس حصہ کے تکملے کے لیے نہ حواس عشرہ کام دیتے ہیں۔ نہ قوت تمیز فائدہ پہنچاتی ہی نہ عقل ہی پوری رہبری کرتی ہی۔ مولنٰا روم اُن جذبات کو بیدار کرنے کے لیے اس طرح اشارہ فرماتے ہیں۔ ؎

پنج حسّے ہست جزایں پنج حس + آں چو زرِ سرخ و ایں حسہا چو مِس
آئینہ دل چوں شود صافی و پاک + نقشہا بینی بروں از آب و خاک [1]

حاسہ رسالت و نبوت

یہ حصۂ زندگانی انسان کا وہ عظیم الشان حصہ ہی کہ بدون اُس کے تمام تعلیم و تعلّم اور ہر شعبۂ زندگی کا ترقی پذیر ہونا عبث و لاحاصل ہی۔ اس حصہ کا تکملہ اس طرح ہوتا ہی کہ اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے کسی ایک کو منتخب فرماتا ہی اور اُسے ایک ایسا حاسہ عطا فرماتا ہی جس کے سامنے تمام حواس سابقہ دست طلب پھیلائے معاونت کے خواستگار ہیں۔ وہ حاسہ ان سب کے اغلاط کو پہچانتا ہی خطاکاریوں کو جانتا ہی ان کے مواقع زلّات [2] سے آگاہ ہوتا ہی جہاں کہیں یہ مغالطہ [3] میں پڑ جاتے ہیں یا تھک کر رہ جاتے ہیں تو وہ شخص (جسے منجانب اللہ وہ حاسہ عطا ہوا ہی) انھیں مغالطات سے آگاہ کرتا ہی اور اُن کے تاریک رستوں میں ایک شمع رکھتا ہی۔ منزل کو اُن پر آسان اور مطلوب کو اُن سے قریب کر دیتا ہی۔ اس حاسہ کا نام نبوت و رسالت ہی۔ اور اُس شخص کو نبی یا رسول کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب اُس کو نبوت و رسالت عطا فرماتا ہی تو پھر وہ ان چیزوں کو دیکھتا ہی جس کو ہماری آنکھیں کسی طرح نہیں دیکھ سکتی ہیں۔ وہ باتیں سنتا ہی جن کو سننے سے ہمارے کان عاجز ہیں۔ وہ مضامین سمجھتا ہی جس کے تعقل [4] سے ہماری عقول بے بہرہ ہیں وہ اعلیٰ علوم بہ نسبتِ فوقانی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے سیکھتا ہی۔ اور خلق کو پھر وہ باتیں بتاتا ہی اور ایسی راہ صراطِ مستقیم کی دکھلاتا ہی کہ جس بات کے سمجھنے سے، اور جس راہ کے پانے سے انسان بدون اس کی رہنمائی و رہبری کے مجبور و درماندہ ہی۔ ہاں نور نبوت سے اگر انسان اپنی اُن مخفی قوتوں کو جس کی طرف مولنٰا روم نے اشارہ فرمایا ہی اور جسے صوفیہ لطائف کہتے ہیں مستنیر [5] بناتا ہی تو پھر وہ بھی عوام کی سطح سے اُسی قدر بلند ہو جاتا ہی جس قدر بصیر نابینا سے ارفع ہی۔ اس کا انکار بجز جاہل و متعصب کے کوئی کر نہیں سکتا۔ لہٰذا اب ہم دوسرے پہلو سے اس بحث کو صاف کرتے ہیں۔

ایک کامل دستور العمل کا معیار

انسان کی طبیعت تمدن کی مقتضی ہی۔ اور چونکہ تمدن [6] اقتضائے طبیعت سے

(۲) روشن ۶ تمدن۔ طرزِ معاشرت، مل کے رہنا، طریقہ (۲) شہریت، مہذب ہونا، خوش حالی، سہولت اختیار کرنا (۳) شہر کا انتظام کرنا

۱ "ان حواس خمسہ کے علاوہ پانچ حواس اور ہیں وہ سونے کی طرح سنہری اور یہ چاندی کی طرح۔ دل کا آئینہ جب صاف اور پاک ہو جاتا ہے تو اس میں آب و خاک سے پرے (ورائے آب و خاک) کے نقوش نظر آتے ہیں۔" ۲ زلات (زل یا زلہ کی جمع) لغزشیں (۲) غلطیاں، خطائیں (۳) پھسلنا، لڑکھڑانا ۳ مغالطہ (جمع مغالطات) دغا، فریب، دھوکا، جھانسا، وہم، مکر (۲) کسی کو غلطی میں ڈالنا، آپس میں غلطی لگ جانا ۴ تعقل۔ کسی کام میں فکر کرنا، بات پر غور کرنا، سوچنا، سمجھنا (۲) خبر دینا، اطلاع دینا ۵ مستنیر۔ نور تلاش کرنے والا، روشنی کی طلب کرنے والا

اس لیے ہر وہ اصول جس کا تعلق تمدن سے ہو اور تمام وہ علوم جو تمدن کو بارونق بنانے والے ہیں انسان
بالطبع ان کی طرف راغب و مائل ہوتا ہے۔ اور اسی تمدن کے اقتضائے طبعی ہونے سے علم انسان کے لیے
ضروری ہو گیا۔ اب یہاں پر یہ بات قابل لحاظ ہے کہ متمدن زندگی ایک زبردست و کامل دستور العمل چاہتی
ہے تاکہ معاملات باہمی میں ایک دوسرے کے حقوق کی محافظت رہے۔ ایک کی صنعت و حرفت و کمال سے
دوسرا بغیر اس کے کہ جانبین میں سے کسی پر زیادتی ہو آپس میں متمتع ہوتے رہیں۔ انسانی بڑی کمزوری یہ ہے
کہ وہ اپنے جذبات کو اعتدال پر قائم نہیں رکھ سکتا۔ اور حق تو یوں ہے کہ جذبات پر قوت حاصل کرنا اور انہیں
افراط و تفریط سے بچائے رکھنا نہایت ہی دشوار ہے۔ انسان کا اس حال میں جب کہ نفس کا سخت حملہ ہوتا ہے
عدل و انصاف پر قائم رہنا بہت ہی اہم و معرکۃ الآرا ہے۔ خاص کر ایسی حالت میں جب کہ اُسے یہ معلوم ہو
کہ مواخذہ کی نگاہ اُسے دیکھ نہیں رہی ہے۔ پس اب جو دستور العمل کہ حیاتِ انسانی کے لیے مقرر کیا جائے
اُن میں حسب ذیل باتوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ (اولاً) اُس کے دستور اور قواعد ایسے ہوں جو ہر طبقاتِ انسان کے
طبائع کے مطالعے کے بعد بنے ہوں تاکہ ہر زمانے میں ہر مقام میں ہر اقوام میں وہ دستور العمل یکساں فائدہ
پہنچائے (ثانیاً) وہ قواعد ایسے ہوں کہ جن پر عمل کرنا ممکن ہو اور اس پر عمل کا لازمی نتیجہ فلاح و بہبود ہو
(ثالثاً) یہ کہ اُس دستور العمل کی واضع وہ ذات ہو جس کی نسبت تمام آدمیوں سے یکساں ہو تاکہ اُس میں
کسی جماعت کی رعایت کی قرابت یا ہم وطن یا ہم قوم ہونے کے سبب سے نہ کی گئی ہو۔ (رابعاً) یہ کہ واضع
قانون کا علم اس قدر وسیع ہو کہ اُسے عمل کرنے والوں کے حال سے ہر آن خبر رہتی ہو۔ (خامساً) یہ کہ اُس کا
دائرہ حکومت اس قدر وسیع ہو کہ جس سے نکل کر بھاگ جانا محال ہو (سادساً) اُس میں سزا و جزا کی قدرت
تامہ ہو (سابعاً) سہو و نسیان کو قصد و ارادہ سے جُدا رکھ سکتا ہو (ثامناً) اطاعت و عدم اطاعت کا اثر
اُس کی ذات یا اُس کی سلطنت پر نہ پڑتا ہو (تاسعاً) کوئی دوسرا اُس کا کسی امر جزئی میں بھی شریک نہ ہو۔
الحاصل حیاتِ انسانی کے لیے کامل دستور العمل تو وہی ہو سکتا ہے جس کا بنانے والا ان کمالات سے متصف
ہو۔ اور خود وہ دستور العمل اپنی ذات سے اس طرح جامع و سہل العمل ہو۔ اب تم خود غور کر لو کہ ایسا دستور العمل
بنانا کیا امکان بشری میں ہے۔ کیا کوئی سلطنت سرّاً و علانیۃً یہاں تک کہ افعال قلوب پر بجز علم الٰہی کے محیط
ہے؟ کیا کوئی طاقت عالم مبدء[1] عالم برزخ[2] عالم معاد[3] تک سوائے قدرتِ خداوندی کے چھائی ہوئی ہے؟ کیا دنیا
میں کوئی قوت ایسی ہے جس کا مقابلہ محال ہو۔ پس اسی لیے اس جل مجدہ نے جس نے انسان کو پیدا کیا

[1] مبدء۔ شروع کرنے/ہونے کی جگہ، ظاہر ہونے کی جگہ (۲) شروع، آغاز (۳) بنیاد، اصل (۴) آغاز کرنے والا، پیدا کرنے والا۔
[2] عالم برزخ۔ موت اور قیامت کے درمیانی عرصہ کے لیے روحوں کے رہنے کا مقام [3] معاد۔ لوٹ کر جانے کی جگہ، واپس جانے کا مقام، جائے بازگشت (۲) (مجازاً) عقبیٰ، آخرت، حشر، قیامت، عاقبت

اُس میں جذبات عطا کیے اس کی طبیعت میں تمدن کا اقتضا خلق فرمایا۔ اسی نے اُن کے لیے ایک کامل دستور العمل اپنے رسول کی معرفت بھیجا جس کو اصطلاح شریعت میں وحی کتاب اللہ کہتے ہیں۔ اس کتاب مقدس میں اصلاح معاش و فلاح معاد کے اصول بتا دیے۔ نیز اوامر پر عمل کرنیوالوں کو مژدۂ فضل و رنواہی پر جسارت کرنیوالوں کو اپنے عتاب[1] کی تہدید[2] بھی سُنا دی۔ اس سے بھی آگاہ فرما دیا کہ سرکشوں کو جو چند روز تک مہلت دیکر تمتعات[3] دُنیا کا حظ[4] وافر دیا جاتا ہے اُس سے دھوکا نہ کھا جانا۔ وہ عذاب الٰہی کا پیش خیمہ و دیباچہ ہے۔ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ[5] (جب اُن باتوں کو جو یاد دلائی گئی تھیں بھلا دیتے ہیں تو ہم ہر چیز کی کامیابی کے دروازے اُن پر کھول دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ ان کامیابیوں پر خوش ہونے لگتے ہیں تو ناگہاں ہم اُن کو اِس طرح اُنھیں پکڑ لیتے ہیں کہ بے آس ہو کر رہ جاتے ہیں۔)

جن قوموں نے نافرمانی اپنا تمغۂ افتخار بنا رکھا تھا۔ اُن کے عبرت ناک واقعات بیان کر کے اچھی طرح ظاہر فرما دیا کہ لَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا[6]۔ علامہ ابن خلدون[7] نے انہی قرآنی قصص سے فلسفہ تاریخ کی بنیاد ڈالی۔ اللہ تعالیٰ جب کبھی کسی واقعہ کو بیان کرتا ہے تو اُس سے کسی خاص نتیجہ کی طرف توجہ دلانی مقصود ہوتی ہے۔ یعنی ع سُنو احوال اگلوں کا سبق لو اور کرو عبرت۔

حقیقی حیات اور حقیقی علم

خلاصہ یہ ہے کہ ہمیں اس کی حاجت تھی کہ اللہ تعالیٰ ایک مکمل دستور العمل[8] ہمارے پاس بھیجے۔ تاکہ اُسے ہم اپنا دلیل راہ ہدایت بنائیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے اپنا کلام اپنے حبیب کی معرفت ہم تک بھیجا۔ اور اِس کلام ربانی کا نازل ہونا تھا کہ دنیا میں ہل چل مچ گئی۔ اور ایک انقلاب عظیم عالم میں پیدا ہوا۔ اب جو دُنیا بن سنور کر نکھری تو یہ وہ دنیا ہی نہ تھی۔ مگر افسوس ہے دنیا پر کہ اُس کا چہرہ پھر دھبوں سے داغدار ہوتا جاتا ہے۔ اُس دستور العمل سے معاصی[9] ہمیں بہت کچھ دور ہٹا کر لے آئے ہیں ؎

سنبھلنے دے ذرا اے ناتوانی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

حضرات! یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ اور خوب یاد رکھیے کہ پوری متمدن زندگی اور صحیح و سچی حیات انسانی جبھی حاصل ہوگی جب کہ بارگاہ نبوت سے تعلیم حاصل کی جائے۔ اور اُس قدر علم کا حصّہ

۷ علامہ عبدالرحمٰن محمد بن خلدون (۱۳۳۲ء تا ۱۴۰۶ء) ۸ دستور العمل۔ قاعدہ، قانون، ہدایت نامہ ۹ معاصی (معصیت کی جمع) گناہ، نافرمانیاں، قصور، خطائیں

۱ عتاب۔ عذاب دینا، دکھ، تکلیف ۲ تہدید۔ تنبیہ، سرزنش، گھرکی، ڈرانا، خوف دلانا، دھمکی (۲) دھمکانا ۳ تمتعات (تمتع کی جمع) فائدہ اٹھانا یا حاصل کرنا (۲) استعمال کرنا (۳) پھل پانا (۴) نفع، فائدہ، بہرہ (۵) لذت، فرحت، خوشی ۴ حظ۔ حصہ، بخرہ، بہرہ، قسمت، نصیب (۲) خوشی و خرمی، انبساط (۳) ذائقہ، لذت ۵ الانعام: ۴۴
۶ "آپ اللہ کے دستور کے لیے ہرگز کوئی تبدیلی نہ پائیں گے۔" (الفتح: ۲۳، الاحزاب: ۶۲ و فاطر: ۴۳)

جس کی تعلیم مختص انبیا علیہم السلام کے ساتھ ہے اور جس تعلیم کے لیے اُن کی بعثت ہوتی ہے۔ اگر نہ حاصل کیا جاوے تو اگرچہ دیگر علوم و فنون سے آپ لا مال ہی کیوں نہ جائیں مگر حقیقت میں آپ مفلس[1] ہی رہینگے۔ گو ظاہر میں آپ کی حیات انسانی معلوم ہوگی مگر حقیقت میں یہ اُس کا ڈھانچ[2] و قالب بیجان ہوگا جو واقعہ میں بیکار و لاسود محض ہے جس طرح جسم بلا روح مُردہ ہے اسی طرح تمام علوم بغیر تعلیم رسالت مردہ ہیں۔ ہمارے تمام علوم مدونہ[3] ہمارے کسب کے نتائج ہیں۔ اس لیے اُن میں خطاؤں کا نہ صرف احتمال بلکہ وقوع ہوا کرتا ہے پھر ہمارے علوم میں یہ قوت کہاں کہ جس سے روح کا تغذیہ[4] ہو۔ برخلاف اس کے پیغمبر کے علوم وحی الٰہی ہوتے ہیں عصمت اُس کی ذاتی صفت ہوتی ہے۔ اُس کے علم میں نفس کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اُس کا علم اغلاط سے پاک اور نقص سے مبرا ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ سراپا رشد و ہدایت ہوتا ہے۔ اسی امر کی طرف اس آیۂ کریمہ میں اشارہ ہے۔ هُوَ الَّذِيٓ اَرۡسَلَ رَسُولَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًا[5]۔ بعد اس کے کہ اس قدر بحث آپ رسالت کے متعلق سُن چکے اس بات کی طرف ذرا توجہ فرمایئے کہ وہ کونسی رہنمائی و ہدایت تھی جسے لیکر ہمارے پیغمبر روحی فداہ تشریف لائے۔ تاکہ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ اچھی طرح آپ سمجھ جائیں۔ اس کے لیے مختصر جملوں میں پہلے عرب کی حالت، ایام جاہلیت کی سننا چاہیئے۔ اُس وقت اس ہدایت کے غلبہ و عظمت کا حال معلوم ہوگا۔

حالت عرب قبل بعثت اور اُس کا علاج

بعثت کے وقت عربوں کی حالت علمی یہ تھی کہ کل چھ سات آدمی مکہ میں ایسے تھے جو اسقدر لکھنا پڑھنا جانتے تھے جس سے کاروبار تجارت اُن کا چلتا رہے۔ اس لیے کہ نوشت و خواند اُن کے خیال میں شیوۂ اراذل[6] تھا نہ غیرت ہو نہ شجاعت۔ تمدن و معاشرت کی اُن کے یہ حالت تھی کہ چمڑے کے خیمے اُن کے مکانات تھے۔ بکریوں اور اونٹ کے گلے اُن کی معیشت۔ جہاں سبزہ اور پانی دیکھا وہیں خیمہ نصب کر دیا ایک موسم میں یہاں ہیں تو دوسرے موسم میں وہاں۔ سلطنت کی اُن میں یہ حالت تھی کہ نہ کوئی اُن کا باضابطہ بادشاہ تھا اور نہ اُن پر حکومت کرنے کے لیے کوئی قانون۔ قبائل کے شیوخ سردار ہوتے تھے۔ کبھی کسی کی اگر جمعیت زیادہ ہو گئی اور دل خوش کن لقب سلطان کا اُس نے قوم سے حاصل کر لیا تو چند روز میں کسی معمولی بات پر کوئی قبیلہ اُس سے الجھکر اُس کا اور اُس کے خاندان کا اور اُس کے ساتھ ہی ساتھ اُس لقب خطاب کا خاتمہ کر دیتا۔ قصائد و اشعار جاہلیت ان تمام باتوں کا کافی ثبوت ملتا ہے۔ اب ایسے حال میں جبکہ قوم میں

---

[1] مفلس۔ محتاج، غریب، نادار جس کے پاس کچھ نہ ہو۔ مفلوک، بے زر [2] ڈھانچ۔ خاکہ، قالب، ڈول، بے بنے پلنگ، چار پائی، کرسی وغیرہ کا چوکھٹا [3] مدونہ۔ جمع کیا ہوا / کیا گیا، ترتیب دیا گیا [4] تغذیہ۔ غذا / خوراک دینا، پالنا (۲) غذا، خورش

[5] ''اللہ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین عطا فرما کر بھیجا تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کر دے اور اللہ کافی گواہ ہے۔'' (الفتح: ۲۸)

[6] اراذل (ارذل کی جمع) بڑے رذیل، کمینے لوگ، نالائق، پنچ، کم ذات، اوچھے

نہ سلطنت ہے نہ تمدن نہ علم نہ امن نہ اتفاق، رسول مبعوث ہوتا ہے۔ وہ اپنی قوم کو ہر حال سے پست اور ہر پہلو سے ضعیف پاتا ہے۔ اُس کے گرد وپیش قیصر وکسرا کی سلطنتیں جہانداری وجہانبانی کا پھریرا اُڑا رہی ہیں۔ ایران کی نفاست پسندی اپنے معاشرتی ناز وکرشمے کی بہاریں دکھلا رہی ہے۔ یونان واسکندریہ کا بحر فلسفہ موجیں مار رہا ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ پیغمبر قوم کو ان سب میں سے کس شے کی طرف بلاتا ہے۔ ایک ایسی قوم جو تمام کمالاتِ انسانی سے خالی وعاری ہو گئی ہو اور دوسری مقابل قومیں بعض کمالات اپنے آپ میں رکھتی ہوں رسول نے اُس وقت میں اپنی قوم کو کیا رہنمائی کی۔ آیا اُن سے یہ کہا کہ اے قوم اُٹھ تلوار ونیزوں کو سنبھال اور تو بھی ایک ملک گیر وجہاندار کی حیثیت مثل قیصر وکسریٰ کے اپنے میں پیدا کر۔ یا یہ کہا کہ اے قوم پتھر دیکھے بُھنے گوشت اور اونٹوں کے کوہان کا کباب کب تک یہ چمڑے کے خیمے میں لمبا رہنا کہاں تک بیدار ہو اور کم از کم ایران جیسی معاشرت تو اختیار کر۔ یا یہ کہا اے اہل عرب یہ جہالت سے اُنس اور علوم وفنون سے وحشت تابکے ہمت کر اور رشکِ اسکندریہ ویونان مکہ کی وادیوں کو بنا دو۔

دیکھئے قوم سرتاسر مریض ہے بیماریوں نے کوئی حصہ جسم کا چھوڑ نہیں رکھا ہے۔ اب اس وقت علاج کونسے مرض کا کیا جائے جس سے تمام بیماریاں خود بخود زائل ہو جائیں۔ آیا اُسے جہالت کے مرض سے علوم عقلیہ پڑھ کر شفا ہو۔ یا تمدن کی مفرحات[1] دیجائیں یا سلطنت کا جواہر مہرہ[2] اُسے استعمال کرایا جائے۔ غرض یہ کہ کیا کیا جائے جس سے یہ مریض نہ صرف صحیح وتندرست ہو جائے بلکہ دوسرے مریضوں کے لیے اُس کا وجود اکسیر[3] اعظم بنجائے۔ تو اس کا صحیح جواب وسچا جواب وہی پہلی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہو گی جو سب سے پہلے آپ نے اپنی قوم کو فرمائی۔ وہی حقیقی علاج تھا اُس قوم مریض کا اور وہی سچی شاہ راہ تھی ترقی کی اور وہی کلید تھی خزائن تمدن کی۔ کیا تم سے وہ اولین تعلیم مخفی ومجہول[4] ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ کہہ آنحضو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ ۔ یہی تھا سرا پا مرض قوم کا علاج کہ اَیُّھَا النَّاس قولوا لا الٰہ الا اللّٰہ[5] جب قوم نے اپنا رشتہ خدا سے درست کر لیا تو پھر وہ تمام تعلقات جن کا علاقہ مخلوق یا کائنات کیساتھ تھا خود بخود سلجھ گئے اللہ سے بُعد الیا بدبخت مرض ہے کہ جس کے سبب سے انسان تمام بدنصیبیوں کا آماجگاہ[6] بنجاتا ہے۔ اور جب اس کا علاج کیا چاہو تو اس بیماری کی دوا نفس کو تمام دواؤں سے زائد کڑوی و کسیلی معلوم ہوتی ہے۔ اور اس لیے نفسِ امارہ اس سے سخت اباکرتا ہے۔ اس وقت میں بھی تم دیکھو گے کہ انسان کو علوم مدونہ حاصل کرنا آسان ہے معیشت کا سامان فراہم کرنا بھی سہل ہے۔ ان چیزوں کے حاصل کرنے کا خود بھی

[1] مفرحات۔ وہ دوائیں، جن سے طبیعت کو فرحت اور خوشی حاصل ہو۔ [2] جواہر مُہرہ۔ اہل فرنگ چند دواؤں سے ترکیب دے کر بہت سے رنگوں کی ایک گولی بناتے ہیں، جس میں تریاق کی خاصیت ہوتی ہے۔ [3] اکسیر۔ کیمیا (۲) کسی بیماری کے لیے جلد اثر کرنے والی اور بے حد مفید دوا [4] مجہول۔ غیر معلوم، گمنام، نامعلوم (۲) انجان، نادانستہ شدہ (۳) وہ فعل، جس کا فاعل معلوم نہ ہو۔ [5] الصحیح المسلم، جلد اول، کتاب الایمان۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، کراچی، طبع ثانی، ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۶ء، ص ۳۷ [6] آماجگاہ۔ نشانے کی جگہ، نشانہ لگانے کا مقام

ولولہ ہوتا ہی اور دوسروں کو بھی جوش میں لا سکتے ہیں۔ لیکن خدا کا خوف دل میں پیدا کرنا اور اُس کو حاضر و ناظر جانکر اپنے معاملات و اخلاق کو درست کرنا نہایت ہی کمیاب بلکہ نایاب ہی۔ پس رسولؐ نے اصلی مرض کی تشخیص کی اور اُس سے صحت یاب ہونے کے لیے ایک قدح[1] توحید کا تیار کیا۔ قوم کڑوی و تلخ دوا دیکھکر بہت کچھ مچلی[2] منھ موڑا ہاتھ پاؤں پھینکے لیکن پیغمبر نے اللہ شافی، اللہ کافی کہکر وہ پیالہ منھ سے قوم کے لگا ہی دیا۔ اب کیا تھا ؎

مست می بیدار گردد نیم شب[3]

مست ساقی روزِ محشر بامداد[3]

دوا کا حلق سے اُترنا تھا کہ صحت کے آثار نمودار ہوئے ہر طرف سے رحمت کے دروازے کھل پڑے۔ علوم و فنون کی باگ بھی مسلمانوں کے ہاتھ میں آگئی اور سریرِ[4] سلطنت پر بھی قبضہ ہوگیا۔

فتوحاتِ اسلامیہ اور علوم مدونہ عربیہ اس وقت تک اُن پاکبازوں کے کمالات و جاہ جلال کا نہایت بلند آہنگی سے اظہار کر رہی ہیں۔ وہ دنیا سے چل بسے لیکن اُن کی مہربانیاں آن سے آیندہ آنیوالی نسلوں کے لیے ہمیشہ شکریہ ادا کراتی رہینگی ؎

ہرگز نمیرد آن کہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما[5]

اسلاف اور اخلاق

تم دیکھوگے کہ جب تک مسلمانوں نے اطاعت الٰہی کو اپنا شعار[6] رکھا اور سرًا و علانیۃً خدا کے بھیجے ہوئے دستور العمل کو اپنا نصب العین بنائے رکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا نمونہ اُن کے پیش نظر رہا اُس وقت تک اُن کی ترقی برق رفتار رہی آج جس چیز کی بازار مسلمین میں کساد بازاری[7] ہی قرون اولیٰ میں اُس کی ایسی فراوانی تھی کہ اپنے تو خیر اپنے ہی تھے بیگانوں تک کے گھروں کی رونق انہی مسلمانوں کے عملیات کا نتیجہ تھا۔ دیکھیے آج یہ رونا ہے کہ مسلمان تمام اقوام سے تعلیم میں پیچھے ہیں اور اس قدر موخر اور اس قدر بطی السیر[8] ہیں کہ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اس قوم کے جوان کے دوش بدوش[9] آبادہی کب تک ہم سفر و ہم منزل ہونگے چہ جائے کہ اُن اقوام کے پہلو میں جگہ پانے کے قابل ہوں جو اس وقت سر بفلک ہیں۔ اور ذرا یہ دیکھو کہ مسلمان جب کہ سچ مچ مسلمان تھے تو کیا اسی طرح اُن علوم دنیاوی سے بے نصیب تھے۔ اس کے لیے زائد مطالعہ

[1] قدح۔ بڑا پیالہ (۲) ساغر، پیمانہ، جام (۳) بادیہ [2] مچلی (مچلانا) طبیعت کا قے پر مائل ہونا / قے کرنے کو جی چاہنا، مالش کرنا، متلانا، ابکائی آنا [3] "شراب کا مست آدھی رات کو بیدار ہو جاتا ہے، ساقی کا مست روزِ محشر کی صبح کو۔" [4] سریر۔ بادشاہی ملک / تخت، سنگھاسن [5] (حافظ) "جس کا دل عشق سے زندہ ہو، وہ کبھی نہیں مرتا۔ کائنات کے صحیفے پر ہماری ہمیشگی ثبت ہے۔" [6] شعار۔ طریقہ، دستور، عادت، طرز

[7] کساد بازاری۔ بازار میں خرید و فروخت نہ ہونا، بازار مندا ہونا، بکری کا نہ ہونا [8] بطی السیر۔ دھیرے دھیرے چلنے والا، جس کی رفتار سست ہو۔ [9] دوش بدوش۔ کندھے سے کندھا ملا کر (۲) اتفاق سے

کی حاجت نہیں ایک سرسری نظر عہد مامون الرشید[1] پر ڈالو۔ خود ہی معلوم ہو جائیگا۔ حدود اسلامیہ کی ماسوا کے دورِ سلطنت میں وسعت کو خیال کرو۔ تمھیں ہر مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ ملیگا۔ ایسے ایسے مدارس اعلیٰ عظیم الشان تم پاؤگے جن میں ہر ایک اپنی ذات سے ایک یونیورسٹی کا حکم رکھتا ہوگا۔ بغداد کا چپہ چپہ تمھیں سائنس کا مرکزِ علوم ہوگا۔ اس عہد میں کتنے علوم ایجاد ہو چکے تھے اور کتنے فنون میں کتابیں تصنیف ہو گئی تھیں۔ تاتاریوں کے حملے اور بغداد کی تباہی[2] کے بعد بھی اگر اُن کی فہرست تیار کی جائے تو ایک اچھی خاصی کتاب کی شکل میں مرتب ہو سکتی ہے۔ اس عہد میں علم کیمیا کے متعلق مسلمانوں نے تقطیر (عرق کھینچنا) تصعید (بخار منجمد کرکے اوڑانا) تسئیج (پگھلانا) ترویق (چھاننا) وغیرہ وغیرہ ایجاد کر لیا تھا۔ زمین کی پیمائش ہو چکی تھی۔ مناظر[3] و مرایا[4]۔ جرِ ثقیل[5] و توازن[6] مائعات[7] پر عجیب و دلکش تحقیقات ہوئی تھی۔ غرض قطع نظر اُن علوم کے جن کا تعلق براہ راست مذہب سے تھا یا جو مذہبی علوم کے خدام و وسائط[8] تھے تم اُن علموں میں جنھیں عقلیہ کہا جاتا ہے مسلمانوں کا ایسا بلند منصب پاؤگے کہ اس وقت تمھیں حیرت ہوگی کہ کیا یہ وہی قوم ہے جو کسی وقت تمام دنیا میں سب کی استاد تھی اور آج شاگردی کے قابل بھی نہ رہی۔ اس عہد کے عام مذاق کا اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ ہر رئیس اپنے مکان کی زینت کتب خانہ کو اور اپنی مجلس کی رونق مذاکرہ علمیہ کو سمجھتا تھا۔ امرا کی جماعت عموماً نا و نوش و فضول و لایعنی باتوں میں اوقات صرف کیا کرتی ہے۔ لیکن اُس زمانہ میں علم کی ہمہ گیری سے وہ بھی نہ بچ سکے۔ علمی کتابوں کا ہونا دقیق مسائل پر مباحثہ قائم کرنا اور خود بحث میں محققانہ حصہ لینا لوازمات[9] امارت[10] سے تھا۔ گلی کوچوں میں سے بھی اگر کوئی گزر جاتا ہے تو کچھ نہ کچھ سیکھ ہی لیتا ہے۔ یہی حال صنعت و حرفت و تجارت کا تھا۔ ہر شخص اپنا کسب کرتا اور اپنی روٹی اپنے دست و بازو سے حاصل کرتا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ نصیحت کہ "اَلسُّؤَالُ ذِلٌّ" (مانگنا خواری ہے) ہر شخص کو یاد تھا۔ اور اس پر خلق اس شدت سے عمل تھی کہ اگر کسی کا کوڑا زمین پر گر جاتا تو سوار خود گھوڑے سے اتر کر اُسے اٹھاتا تھا۔ کسی دوسرے سے اٹھانے کو کہنا داخلِ سوال سمجھا جاتا تھا۔ مجھے اس پر ایک واقعہ عہد رسالت کا یاد آیا۔ ایک مفلس شخص دربارِ رسالت میں حاضر خورد و نوش کے لیے سوال کرتا ہے آپ اُس سے فرماتے ہیں کہ تیرے گھر میں کوئی سامان ہے جواب نفی میں ہوتا ہے۔ دوبارہ فرماتے ہیں کہ کچھ تو ہوگا۔ غور کر۔ غرض بہت فکر و خوض کے بعد اُس نے سوچکر عرض کیا کہ ہاں ایک فرسودہ[12] پالان[13] رکھا ہوا ہے آپ نے فرمایا کہ اُسے لے آ۔ جب اُس نے سامنے لا کر حاضر کر دیا تو آپ نے اصحاب سے فرمایا کہ تم میں کون ہے جو اس محتاج کے کہنہ و فرسودہ پالان کو خرید لے۔ ایک صحابی نے

[1] خلفاءِ عباسیہ کے ساتویں خلیفہ مامون الرشید بن ہارون الرشید (۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ) علومِ عقلی و نقلی میں تمام خلفاءِ بنو عباسیہ سے بڑھ کر تھا اور سخاوت و شجاعت میں مشہور امام ہے۔ اقلیدس کا ترجمہ اسی نے کرایا۔ [2] ۱۲۵۸ء تا ۱۲۶۰ء [3] مناظر (منظر کی جمع) تماشا گاہیں (۲) دیکھنے کے لائق مقامات، حسین نظارے [4] مرایا (مراۃ کی جمع) خلاف قیاس، آئینے، منہ دیکھنے کے شیشے، برتن

[5] جرِ ثقیل۔ بھاری بوجھ کو آسانی سے اٹھا لینے کا علم، چرخیوں کا علم (۲) بھاری بوجھ [6] توازن۔ دو اشیا کا باہم برابر اور ہم وزن ہونا (۲) برابر تول کر لینا (۳) تناسب [7] مائعات (مائع کی جمع) بہنے والی چیزیں جیسے پانی، تیل وغیرہ

[8] وسائط (واسطہ کی جمع) لیے، واسطے، وسیلے، وجہ، سبب [9] لوازمات (لازمہ کی جمع الجمع) ضروریات [10] امارت۔ علامت نشانی [11] یہ الفاظ یہاں منفیاً استعمال ہوئے۔ [12] فرسودہ۔ گھسا پھٹا، گھٹا ہوا، بہت پرانا، بوسیدہ

[13] پالان۔ بارکش جانور کی کاٹھی، ٹاٹ اور نمدہ وغیرہ جو بار برداری کے گدھے گھوڑے اونٹ وغیرہ کی پشت پر اس کے بچاؤ کے لیے ڈالا جاتا ہے۔

دو درہم قیمت دیکر اُسے خریدلیا۔ آپ نے ایک درہم اُسے دیکر فرمایا کہ جا بازار سے ایک کلہاڑی خرید لا۔ جب وہ کلہاڑی لے آیا تو آپ نے اپنے دستِ مبارک سے اُس میں لکڑی کا ایک بینٹ لگا دیا، اور اُس سے کہا کہ ایک درہم جو بچا ہوا ہے وہ اپنی بی بی کو جا کر دے تاکہ آج کے کھانے کا وہ اس سے سامان کرے اور تو کلہاڑی لیکر جنگل جا، اور لکڑیاں لا کر بازار میں فروخت کر، اس طرح اپنی روزی اپنے قوّتِ بازو سے پیدا کیا کر۔ خیال کرنا چاہیئے کہ اسلام نے کہاں تک ہمیں باغیرت اور کہاں تک کار باری بنانا چاہا تھا، مگر ہم نے اپنے آپ کو کیا بنا ڈالا۔ افسوس تباہی خود ہم اپنے اوپر لائیں اور اتہام اسلام پر رکھیں۔

اب جب کہ مسلمان اپنے اُس دستور العمل سے، جو خدا نے اُن کے صلاحِ معاش و معاد کے لیے بھیجا تھا، ہٹنے لگے تو سب خرابی آہستہ آہستہ اُن میں آنے لگی۔ زبردست زیردستوں پر ظلم کرتا، ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ نہ کرتا، اس سے فساد و نااتفاقی پیدا ہوئی، امنِ عامہ میں خلل واقع ہوا جس سے علم و صنعت کی سرد بازاری ہونی شروع ہو گئی۔ اسی طرح ایک ایک نصیحت پر عمل چھوٹتا گیا اور تنو تنو خرابیاں آتی گئیں۔ اب نہ علم ہے نہ تجارت، نہ صنعت ہے نہ زراعت، ہائے ہائے کیا کر دیا اسلاف کے کارنامہ پڑھ کر فخر و مباہات کرتے ہو، اس سے کیا ہوتا ہے۔

عزیزو! جس طرح کل گزشتہ کا کھانا آج کی بھوک کو دفع نہیں کر سکتا، اُسی طرح گزشتہ اقبال کا تذکرہ آج ہمیں اقبال مند نہیں بنا دے گا۔ جس طرح میّت پر نوحہ کرنے سے اُس کی مراجعت نہیں ہوتی اُسی طرح ہائے وائے کرنے سے وہ نعمتِ اسلامی واپس نہیں آتی ؎

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدی وصال

صد سال می تواں بہ تمنّا گریستن

ہاں اُس چیز کو پھر حاصل کرو جس کے طفیل میں سب کچھ آگیا تھا۔ بغیر اس کے ترقی محال ہے اور یہ استحالہ کا حکم میں نہیں دے رہا ہوں بلکہ قرآن کریم کا یہ فتویٰ ہے! اور نیز وہ فتویٰ ہے جس کا مشاہدہ تم ہر روز ہر شخص میں کیا کرتے ہو۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ؂ اُن جذبات کو جو ہمارے نفوس میں ودیعت کیے گئے ہیں جب تک ہم صحیح راہ اعتدال پر نہ لائیں گے، ہرگز ترقی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔

۱ بینٹ۔ دستہ کلہاڑی وغیرہ میں لگی ہوئی لکڑی ۲ کار باری۔ کام کاج کا آدمی (۲) سوداگر، تاجر، تجارت پیشہ۔
۳ اتہام۔ بہتان، الزام، تہمت تراشنا ۴ صلاحِ معاش و معاد۔ آخرت / عقبیٰ اور جائے زندگی یعنی دنیا کی بہتری و بھلائی۔
۵ مباہات۔ شیخی، بڑائی، فخر / ناز کرنا (۲) شان و شوکت (۳) اترانا ۶ اقبال مند۔ خوش قسمت، خوش نصیب (۲) دبدبہ والا۔
۷ (عرفی شیرازی) "اے عرفی! اگر گریہ وزاری سے وصال میسر ہو سکتا تو حصولِ مدعا کے لیے سو سال رونا بھی ممکن تھا۔"
۸ استحالہ۔ محال ہونا، ناممکن ہونا، دشوار جاننا (۲) طلب محال، دشوار پسندی ۹ "خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی — نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا" (الرعد:۱۱)

اصولِ ترقی اور قرآن کریم

آؤ ہم اپنے ترقی کے اصول قرآن کریم سے دریافت کریں جو وہ بتائے اُسی راہ پر چلنے کی کوشش کریں اگر اس سعی کا نتیجہ اس قدر بھی ہو کہ ہم اپنی موجودہ حالت سے انحطاط[1] نہ کریں اور روز افزوں پستی سے نجات پا جائیں تو شاید اُس وقت آگے بڑھنا بھی آسان ہو جائیگا! اس وقت تو ہر لمحہ ہمیں فنا کے سیل میں بہائے لئے جا رہا ہے۔

گرے جاتے ہیں اپنے آپ نظروں سے ستم یہ ہے
بدل جاتے تو کچھ رہتے مٹے جاتے ہیں غم یہ ہے

قرآنِ کریم ہمیں یہ راز اس طرح بتلاتا ہے کہ اگر ہم اپنی اس نسبت کو جو ہمیں اپنے خالق سے ہونی چاہئے اور اُس تصرف کو جو ہمیں کائنات پر اللہ کی جانب سے عطا ہوا ہے صحیح طور پر درست کرلیں تو پھر وہی ہم ہیں اور وہی اقبال۔ اس کے لئے (اولاً) ہمیں اپنی استعداد (ثانیاً) اپنا جائز تصرف معلوم ہونا چاہئے۔ ان میں سے ہر ایک کو قرآنِ کریم سے سنئے کہ شاید اللہ تعالیٰ کسی کو توفیق عطا فرمائے۔

کلام اللہ میں عزّ مجدہٗ نے ہماری استعداد سے اس طرح ہمیں آگاہ فرمایا ہے کہ اے انسان تیری ساخت سب سے بہتر ہم نے بنائی ہے! اب اگر تو اپنے آپ کو خراب کریگا تو اس کا تو خود ذمہ دار ہے اور اگر میری بتلائی راہ پر زندگی بسر کریگا تو تیرے اجر کا سلسلہ غیر متناہی[2] ہوگا۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِيْنَ إِلَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ[3]۝ اس سے یہ تو قطعی طور پر معلوم ہو گیا کہ اگر ایمان و عمل صالح ہے تو پھر اجر کا سلسلہ غیر متناہی ہے اور اگر یہ نہیں تو پھر خوبی و کمال کا تو ذکر ہی کیا، اپنی اصل خلقت پر بھی قیام ناممکن ہے، اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ[4] ہی میں جا کر ٹھہرینگے۔ غرض ہم میں ایسی قابلیت و استعداد ہے کہ ہم اپنے آپ کو جیسا چاہیں ویسا بنا سکتے ہیں۔ استعدادِ انسان کے متعلق اسی قدر پر کفایت کیجئے۔

انسان اور کائنات عالم سے تعلقات

اب اپنے اُس تصرف و تعلق کو دیکھئے جو انسان کا کائنات کے ساتھ ہے۔ اس تعلق کے جاننے کے بعد ایک عجیب پُر فضا کامیابی کا میدان سامنے آجاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عالم میں ہمارے سوا جس قدر مخلوق ہیں خواہ وہ جماد یا نبات یا حیوان ہوں، خواہ کائنات الجو[5] کے موجودات ہوں مثل سحاب و باراں وغیرہ، خواہ عالم علوی کی چیزیں ہوں مثل آفتاب، ماہتاب، زہرہ و مشتری وغیرہ سب کے سب ہماری خادم ہیں اور ہم مخدوم۔ ہر ایک سے ہماری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور ہر ایک سے ہم اپنا کام لیتے ہیں اور کام بھی اس طرح ہم ان سے لیتے ہیں کہ ان اشیا کو کسی وقت اپنی خدمت کے عوض کا نہ تو کسی طرح

1 انحطاط۔ کم ہونا، گھٹنا/گھٹاؤ، نیچے اترنا، کسی چیز کا کمی کی طرف مائل ہونا، تنزل 2 غیر متناہی۔ جس کی انتہا نہ ہو، بے حد 3 التین: ۵،۶
4 ’’یعنی پھر نافرمانی کی وجہ سے انسان کو سب سے نیچے درجہ کی مخلوقات سے بھی نیچے کر دیا۔‘‘ (عزیز الحق کوثر ندوی، علامہ۔ جواہر البیان فی تفسیر القرآن، جلد دوم، مطبوعہ بنارس) 5 کائنات الجو۔ آسمان اور زمین کے درمیانی فاصلہ/خلا کی دنیا

خیال ہوتا ہے ورنہ ہم بالعوض اُن کے کام کرنے کا ارادہ کرتے ہیں اور نہ کرسکتے ہیں۔ گویا کہ ہم سراپا مخدوم ہی مخدوم ہیں۔ صرف اُن کا استعمال میں لانا اُن سے فائدہ حاصل کرنا یہی اُن کی خدمت ہے۔ قرآن شریف ہمارے اسی تعلق کو یوں بیان کرتا ہے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً[1] پھر دوسری جگہ فرماتا ہے وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰھُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ[2] ان آیات سے کرامت و خلافت انسان کی مسلم ہو چکی۔ اب آگے بڑھئے ارشاد فرماتا ہے سَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِہٖ[3] یعنی اللہ کے حکم سے ستارے، چاند، آفتاب، دن رات، سب تمہارے مسخر[4] ہیں۔ پھر فرماتا ہے سَخَّرَ لَکُمُ الْبَرَّ وَالْبَحْرَ[5] دریا اور زمین خشکی و تری، تمہارے مسخر کر دیئے۔ ان دونوں آیات سے معلوم ہوا کہ عالم علوی تک کی پرشوکت چیزیں انسان کی مسخر ہیں۔ خود وہ زمین جس پر انسان آباد ہے اور سمندر جو دنیا کو گھیرے ہوئے ہے یہ بھی انسان کے مسخر ہیں۔ ان چیزوں میں انسان اگر تصرف[6] کرے تو اس کا پورا حق ہے۔ لیکن زمین پر نبات و حیوان بھی ہیں شاید ان پر دست درازی[7] و انتفاع[8] کا دعویٰ غلط ہو اور یہ خود متصرف[9] ہونے کی حیثیت رکھتے ہوں۔ آیئے اس کا فیصلہ بھی کلام اللہ سے کرلیں۔ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَی الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِہٖ زَرْعًا تَاْکُلُ مِنْہُ اَنْعَامُھُمْ وَاَنْفُسُھُمْ اَفَلَا یُبْصِرُوْنَ۔[10] ہم اُفتادہ زمین پر پانی بہاتے ہیں اُس سے زراعتیں پیدا ہوتی ہیں کچھ تو خود کھاتے ہو اور کچھ تمہارے جانوروں کے چارے ہوتے ہیں کیا میرے اس کرم کو نہیں دیکھتے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ زمین جو کچھ اُگاتی ہے وہ سب ہمارے ہی لئے ہے، بعض کو ہم خود کھاتے ہیں اور کچھ حصے کو اپنے جانوروں کا چارہ بناتے ہیں۔ اب رہے حیوان ان کا بھی فیصلہ کر لیجئے وَالْاَنْعَامَ خَلَقَھَا لَکُمْ فِیْھَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْھَا تَاْکُلُوْنَ وَلَکُمْ فِیْھَا جَمَالٌ حِیْنَ تُرِیْحُوْنَ وَحِیْنَ تَسْرَحُوْنَ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَکُمْ اِلٰی بَلَدٍ لَّمْ تَکُوْنُوْا بٰلِغِیْہِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اِنَّ رَبَّکُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ وَّالْخَیْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِیْرَ لِتَرْکَبُوْھَا وَزِیْنَةً وَیَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ[11] خلاصہ و مختصر ترجمہ اس کا یہ ہے کہ چارپائے ہیں کہ تمہارے لئے پیدا کئے ہیں، اُن سے گوناگوں نفع حاصل کرتے ہو، جاڑے کا سامان اُن کے اون سے بناتے ہو بعض کو ان میں سے کھاتے ہو، صبح کو وہ چرائی کو جاتے ہیں یا شام کو جب واپس آتے ہیں تو اُن میں ایک قسم کا جمال دیکھتے ہو، تمہارا بوجھ کو ایک شہر سے اٹھا کر دوسرے شہر پہنچاتے ہیں جس کا لیجانا تم پر شاق ہوتا، گھوڑے، خچر، گدھے، تمہارے سواری کے لئے پیدا کئے، اور بہت چیزیں تمہارے لئے اللہ پیدا کر رہا ہے جسے تم نہیں جانتے۔

ہماری مخدومیت کی غایت اب تو ہر طرح اطمینان ہو گیا کہ یہ تمام چیزیں ہمارے ہی لئے ہیں یہ سب

1 "میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔" (البقرۃ:۳۰) 2 "اور بے شک ہم نے اولادِ آدم کو معزز کیا اور انہیں خشکی اور تری (دریا) میں سوار کیا۔" (بنی اسرائیل:۷۰) 3 النحل:۱۲ 4 مسخر۔ تسخیر/تابع کیا گیا، مطیع، فرماں بردار، مغلوب 5 خطاب میں یہ الفاظ مخدوم کے طور پر آئے ہیں۔ 6 تصرف۔ دخل کرنا/دینا، کام پر ہاتھ ڈالنا، استعمال، اختیار، قبضہ (۲) خرچ، صرف 7 دست درازی۔ ظلم، زیادتی (۲) عہد شکنی (۳) مارپیٹ (۴) لوٹ مار 8 انتفاع۔ فائدہ، نفع، حاصل، آمدنی (۲) نفع پانا/اٹھانا، فائدہ حاصل کرنا 9 متصرف۔ تصرف کیا گیا، قبضہ کیا گیا 10 السجدۃ:۲۷ 11 النحل:۵-۸

خدام ہیں اور ہم مخدوم[1] لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ ہم صرف مخدوم ہی کیوں رہے۔ سلسلہ تو یوں ہے کہ جماد نبات کے کام آتا ہے اور نبات جماد کے کام تو نہیں آتا لیکن حیوان کے کام آتا ہے۔ اسی طرح حیوان نبات کے لئے کچھ مفید نہیں لیکن انسان کا مسخر و غلام ہے تو جبکہ یہ سلسلہ مخلوق[2] میں پایا جاتا ہے کہ ادنیٰ اعلیٰ کا خادم اور وہ اپنے سے بلند تر کا خادم تو پھر اس کی کیا وجہ کہ باوجود مخلوق و حادث و ممکن[3] ہونے کے ہم کسی کے خادم نہ ہوں۔ تھوڑے سے غور سے یہ معمّا[4] حل ہو جاتا ہے کہ تمام مخلوق سے چونکہ انسان اعلیٰ و بالا قرار پایا ہے ہر چیزیں اس کی مسخر کر دی گئی ہیں، تو پھر اسے مخلوق کا خدمت گذار نہ ہونا چاہیئے! بلکہ یہ تو خالق کا غلامی کرنے والا اور اسی کا عبادت گذار ہے اور صرف اسی غلامی نے اسے یہ مرتبہ دیا ہے کہ جس کے باعث یہ سب مخلوق پر حاکم ہے اسی امر کی طرف سعدیؒ نے اشارہ کیا ہے ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند	تا تو نانے بکف آری و بہ غفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار	شرطِ انصاف نباشد کہ تو فرماں نہ بری

اب ذرا اس طرف متوجہ ہوجئے کہ جب آفتاب و ماہتاب، نجوم و زمین و دریا وغیرہ وغیرہ سب ہمارے مسخر کر دیئے گئے تو اب ضرور ہوا کہ ہمیں اپنے تابعداروں سے کام لینے کا سلیقہ بھی ہونا چاہیئے: ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ کس سے کونسا کام لینا ہے جس قدر ہمیں ان سے کام لینا کا طریقہ و علم زیادہ ہوتا جائیگا اسی مناسبت سے ہم اپنی حکومت میں کامل سمجھے جائینگے اور ہماری یہ حکومت اور ان تابعداروں سے خدمت لینا عین مرضی الٰہی کے مطابق ہوگا۔

تمدن و سائنس اور قرآن مجید

پس اے عزیزو! کیا تمدن کی روح اس کے سوا کوئی اور چیز ہے؟ کیا سائنس الٰہی اس امر کو منکشف[5] نہیں کرتا کہ کس چیز کو ہم کس طرح اپنے کام میں لائیں؟ اگر یہی بات ہے اور ضرور یہی ہے تو میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ تمدن و سائنس کی سنگ بنیاد قرآن کریم کی یہی تعلیمات ہیں۔ سائنس پڑھنا، اس میں کمال پیدا کرنا حقیقت میں مسخرہ مخلوق سے مستفید ہونا ہے اور ان کے مسخر ہونے کو بامعنی بناتا ہے۔ کوئی وجہ اس کی نہیں کہ قرآن ہمیں جن امور کی طرف رہنمائی کرے جن سے بہرہ مند[6] ہونے کی ترغیب دلائے ہم اسے مذہب کے خلاف سمجھیں پھر تو کھانا پینا، پہننا، رہنا سب ہی دشوار ہو جائیگا۔ رہی یہ بات کہ کونسی زبان میں ان علوم کو پڑھیں؟ اس تنگ وقت میں زیادہ بحث کا تو موقع نہیں لیکن اسقدر سمجھ لیجئے کہ اردو، فارسی، پنجابی، پشتو، بنگلہ وغیرہ وغیرہ تو جائز ہوں مگر یورپ کی زبان حرام

---

[1] مخدوم - خدمت کیا گیا/کیا ہوا، قابل تعظیم، آقا، بزرگ، سردار [2] حادث - نیا، نئی چیز، وہ چیز جو نئی پیدا ہوئی ہو اور پہلے سے نہ ہو، نیا امر ظہور میں آنے والا (۲) فانی، فنا ہونے والا [3] ممکن - جو بات ہو سکے، ہو سکنے والی بات (۲) (کنایۃً) مخلوق، انسان [4] معمّا - پوشیدہ/چھپی ہوئی چیز مخفی، بھید کی بات۔ وہ بات، جو بطور رمز بیان کی جائے۔ (۲) ایک قسم کی چیستان (۳) الجھا ہوا مسئلہ، پیچیدہ بات [5] منکشف - کھلنے والا، ظاہر ہونے والا [6] بہرہ مند - صاحب نصیب، نصیبہ والا، خوش نصیب، خوش طالع، بیدار بخت، اقبال مند (۲) فائدہ پانے والا

آخر اس کی وجہ؟ اگر آج تمام یورپ یا کوئی اور کا حصہ دائرۂ اسلام میں آجائے تو کیا اُسے اپنی مادری زبان کا بولنا یا اس میں پڑھنا حرام ہو جائیگا؟ کیوں خدا کی رحمت کو اس قدر تنگ کیا جائے؟ اور ترجیح بلا مرجح دیجاوے؟
الحکمۃ ضالۃ المؤمن حکمت مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ اپنی چیز جہاں کہیں ملجائے اُسے فوراً اٹھالو ؎

سخن کز بہر حق گوئی چہ عبرانی چہ سریانی
مکان رہبر او جوئی چہ جابلقا چہ جابلسا

حضرات! کوئی وجہ اس کی نہیں کہ تعلیمات قرآنی سائنس کے سامنے سپر ڈال دیں۔ اور سائنس جاننے والا قرآنِ مجید کو (نعوذ باللہ) سُبکی کی نگاہ سے دیکھے یا اس کے فہم و تلاوت سے اپنے کو مستغنی سمجھے۔ اس لئے کہ سائنس کی بحث مادہ و متعلقاتِ مادہ تک محدود ہے۔ حیاتِ دنیا کو بارونق بنانا، لوازمات حیوانی کے لئے سامان فراہم کرنا اس کی غایت ہے۔ لیکن قرآن کی تعلیم مادیات سے بہرہ مند ہونے کی طرف ایک لطیف اشارہ کرتے ہوئے ہمارے جذبات کو معتدل، افعال قلوب کو مزین بناتی ہے اس سے پھر آگے بڑھکر تربیت روح کی کرتی ہے معاد کی حیات کو آراستہ کرتی ہے اس مقام پر تو سائنس کے پر جلتے ہیں، سائنس غریب کو تو اس کی ہوا بھی نہیں لگی ہے۔

قابل گریہ نظارہ

اس بات کو خوب یاد رکھو کہ سائنس نے توحید و الوہیت نبوت و رسالت وحی و الہام وغیرہ سے کبھی بحث نہیں کی چہ جائیکہ سائنس نے ان باتوں کا انکار کیا ہو۔ اگر کوئی ایسا کہتا ہے تو یقین جانو کہ اس نے سائنس کو قطعاً نہیں سمجھا۔ یہ اس پر افترا رکھتا ہے بہتان رکھتا ہے، سائنس اس سے بیزار ہے اور اس بیجا حمایت سے فریادی ہے تم بھی ایسے شخص کی باتوں سے منہ پھیر لو اور اس کے لئے دعائے ہدایت کرو۔

دوستو! کیا یہ بے انصافی نہ ہوگی کہ ہم اپنے جسموں سے تو کام لیں کائنات سے بہرہ مند ہوتے رہیں! لیکن جس کی اطاعت کے لئے ہم پیدا کئے گئے ہیں اس کی طرف بھول کر بھی توجہ نہ کریں! بلکہ اُسے ایک لایعنی امر سمجھیں یہ کیسی بے انصافی و صریح ہٹ دھرمی ہے۔ اگر یہ پہلو ہماری زندگی کا تاریک رہا تو ہم کمال انسانی کے عرفان سے قاصر رہے اور سخت باز پرس منعم حقیقی کی اپنے اوپر عاید کرلی بغیر اطاعت الٰہی و عبادت معبود جو زندگی بسر ہوئی وہ حیوانی حیات سے ایک انچ بھی بڑھ نہ سکی ہائے افسوس کہ اس زمانہ میں عبادت کی لذت سمجھانا نہایت ہی دشوار و اہم ہوگیا۔ تواریخ سے یہ پتا چلتا ہے کہ جب دنیا میں علوم عقلیہ کے ساتھ لوگوں کے

۱ مرجح۔ ترجیح دیا ہوا، کسی پر فوقیت دیا گیا (۲) ترجیح دینے والا ۲ جامع ترمذی، ابواب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ، جلد ثانی، ص ۹۸، ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی ۳ (حکیم سنائی غزنوی) "جو بات تم حق کے لیے کرو، وہ عبرانی ہو یا سریانی کوئی فرق نہیں پڑتا، جو جگہ تم حق کی خاطر ڈھونڈتے ہو وہ جابلقا ہو یا جابلسا ایک ہی بات ہے۔"
۴ سپر ڈالنا۔ ہتھیار ڈالنا، شکست کھانا، مغلوب / عاجز ہوجانا ۵ سُبکی۔ ہلکا پن (۲) بے قدری، بے عزتی، ذلت ۶ مستغنی۔ بے پرواہ، دولت مند

حد سے زائد غلو کیا تو وہ عبادت سے غافل و متہاون و سست ہو گئے لیکن اس دور ایام کو کیا کہئے کہ ایک طرف تو جہالت کی گھٹا چھائی ہوئی ہے، دوسری طرف تدین سے دامانِ عمل خالی ہے۔ عامۃ مسلمین کی حالت کا اندازہ کرو تو خود معلوم ہو جائے گا کہ ہم راہِ مستقیم سے کس قدر منحرف ہو گئے ہیں: مساجد ہیں لیکن نمازی نہیں۔ قرآن کی جلدیں متعدد موجود ہیں مگر تلاوت نصیب نہیں۔ تجوید و عربی لحن سے قرآن پڑھنا آتا ہے لیکن اس پر عمل کی توفیق نہیں، عبادتیں ویران، معاملات تباہ، تعلقات پراگندہ، اخلاق ردی پھر کیا امید بھلائی کی ہے؟

شد پریشان خواب من از کثرت تعبیرہا

اصلاح قوم کے لئے کوئی تجارت کی رغبت دلاتا ہے کوئی علوم مغربی کے سحر آفریں فضائل سناتا ہے کوئی علوم مشرقی کی ہدایت کرتا ہے کوئی صنعت و حرفت کی طرف مائل کرتا ہے؛ لیکن خدا تو یہ فرماتا ہے کہ تم میرے مطیع ہو جاؤ پھر سب چیزیں تمہاری تابع فرمان ہو جائنگی ۔

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

تم اللہ کے ہو جاؤ، تمام چیزیں تمہاری ہو جائنگی۔ تم اللہ سے پھر جاؤ گے تمام نعمتیں تم سے منہ موڑ لینگی ۔

چوں از و گشتی ہمہ چیز از تو گشت
چوں از و گشتی ہمہ چیز از تو گشت

ہماری اخلاقی حالت اس درجہ بدتر ہو گئی ہے کہ عیب کو ہم ہنر سمجھنے لگے اور تملیح کو کمالِ دانشمندی۔ یہ وقت اس کے بیان کرنے کا نہیں ہے جسے اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرماوے وہ کلام مجید کی تلاوت با ترجمہ کر جاوے اور اس میزان پر اپنے آپ کو تول لے کہ کہاں تک صدق و حق کا پلہ وزنی ہے اور کہاں تک تزویر و ریا کا۔ اخلاقِ حسنہ کہاں تک پائے جاتے ہیں اور کس حد تک آپ اپنے جذبات پر قدرت ہے اکس مرتبے تک حقوق العباد کے ادا کرنے میں وہ سرگرم ہے۔ میں اس وقت دو واقعے آپ کے سامنے گزارش کرونگا جس سے آپ اس امر کا فیصلہ کریںگے کہ اخلاق کی قوت کس درجہ ہے۔

معیارِ صداقت نبوت

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے جبکہ ہرقل قیصر روم کے پاس اپنا قاصد بھیجا ہے تو اس نے عربوں کی اس جماعت کو جو اس کے ملک میں تاجرانہ حیثیت سے گئے ہوئے تھے تحقیق حال کے لئے طلب کیا۔ اب تم ذرا اس کو دیکھو کہ وہ کیا پوچھتا ہے اور ہر سوال کے جواب سے

۱ غلو۔ ہجوم (۲) حد سے گزرنا، مبالغہ، بڑھا چڑھا ہونا ۲ متہاون۔ سستی کرنے والا (۲) حقیر، خوار ۳ تدین۔ دین داری، پرہیزگاری، دیانت داری ۴ پراگندہ۔ متفرق، منتشر، تتر بتر، پریشان، بکھرا ہوا ۵ ردی۔ بگڑا ہوا، نکما، ناقص، ناکارہ، خراب (۲) متذبذب، متفکر، متردد (۳) پریشان، حیران ۶ "تم بھی خدا کے حکم سے سرکشی نہ کرو تاکہ کوئی بھی تمہارے حکم سے سرتابی نہ کرے۔"

۷ "جب تم اس کے ہو جاتے ہو تو سب کچھ تمہارا ہو جاتا ہے جب تم اس سے دور ہو جاتے ہو تو سب کچھ تم سے منہ موڑ لیتا ہے۔" ۸ تملیح۔ نمکین کرنا، چاشنی دینا (۲) کلام میں کسی قصہ یا آیات یا احادیث یا اصطلاح کی طرف اشارہ کرنا ۹ تزویر۔ جعلسازی، فریب (۲) جھوٹ کو سچ بنانا، مکر کرنا ۱۰ ہرقل۔ بادشاہ روم کا لقب

وہ کیا نتیجہ نکالتا ہے۔ میں یہاں پر حدیث کا وہ حصہ جو سوال و جواب پر ہے پڑھ کر سناؤں گا تاکہ آپ کو کامل لطف حاصل ہو اور صحیح فیصلہ کر سکیں۔ اس کے دس سوال ہیں نمبر وار سنتے جائیے۔

(۱) کیف نسبہ فیکم آن کا نسب تم میں کیا ہے؟ قلت ھو فینا ذو نسب مجیب کتا ہے وہ ہم میں شریف النسب ہے" ہرقل اس جواب کو سنکر کہتا ہے کذالک الرسل تبعث فی نسب قومہا ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ قوم میں پیغمبر شریف ترین نسب کا ہوتا آیا ہے۔

(۲)

ھل قال ھذا القول منکم احد قط قبلہ۔ اس سے پیشتر دعویٰ نبوت عرب کی سرزمین میں کسی اور نے بھی کیا تھا؟ جواب قلت لا۔ میں نے کہا نہیں۔ ہرقل کہتا ہے فقلت لو کان احد قال ھذا القول قبلہ لقلت رجل یأتسی بقول قیل قبلہ۔ تمہارا جواب نفی میں سنکر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر تم ہاں کہتے تو میں کہتا کہ یہ شخص ایک ایسا آدمی ہے جو اپنے سے پہلے کہی ہوئی بات کی ریس کرتا ہے۔

(۳)

ھل کان من آبائہ من ملک۔ آباؤ اجداد میں اس کے کوئی بادشاہ گذرا ہے؟ فقلت لا میں نے کہا نہیں" ہرقل کہتا ہے قلت لو کان من آبائہ من ملک قلت رجل یطلب ملک ابیہ میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر آباؤ اجداد میں اس کے کوئی بادشاہ گذرا ہوتا، تو میں کہتا کہ یہ ایک ایسا شخص ہے جو باپ کا ملک اسی حیلہ سے طلب کرتا ہے۔

(۴)

فاشراف الناس اتبعوہ ام ضعفاءھم قوم کے صنادید اس کی پیروی کرتے ہیں یا ناتوان اشخاص؟ فقلت بل ضعفاءھم میں نے کہا بلکہ ناتوان اس کے دین کو لبیک کہتے ہیں۔ ہرقل کہتا ہے ھم اتباع الرسل رسولوں کی پیروی جماعت ہوتی چلی آئی ہے۔

(۵)

ایزیدون ام ینقصون۔ یہ لوگ بڑھتے جاتے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں قلت بل یزیدون میں نے کہا وہ ہر روز بڑھتے جاتے ہیں" ہرقل کہتا ہے کذالک امر الایمان حتی یتم ایمان کی یہی شان ہے یہاں تک کہ تمام ہو جاوے۔

(۶)

هل یرتد احد منهم سخطة الدینه بعد ان یدخل فیه اُس دین میں داخل ہو کر کوئی اس سبب سے مرتد بھی ہو جاتا ہے کہ اُس دین میں نفرت انگیز باتیں تھیں۔ فقلت لا۔ میں نے کہا "نہیں" ہرقل کہتا ہے۔ کذالك الایمان حین تخالط بشاشة القلوب ایمان ایسا ہی لطیف ولذیذ ہے کہ دل کو اس سے فرحت و انبساط ملتا ہے۔

(۷)

هل کنتم تتهمونه بالکذب قبل ان یقول ما قال دعوائے نبوت سے قبل تم نے آپ سے جھوٹ بولنے سے بھی متہم کیا ہے؟ فقلت لا۔ میں نے کہا "نہیں" ہرقل کہتا ہے۔ فقال اعرف انه لم یکن لیذر الکذب علی الناس و یکذب علی اللّٰہ میں نے جان لیا کہ جس نے انسان پر جھوٹ نہیں رکھا وہ خدا پر کیونکر جھوٹ رکھیگا کہ اللہ نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے۔

(۸)

فھل یغدر۔ دھوکا، فریب یا نقض عہد[1] کرتے ہیں؟ فقلت لا۔ میں نے کہا "نہیں" ہرقل کہتا ہے۔ کذالك الرسل لا یغدر رسول کی شان یہی ہے کہ وہ غدر[2] نہ کرے۔

(۹)

هل قاتلتموه۔ تم سے آپ نے کبھی لڑائی ہوئی؟ فقلت نعم میں نے کہا "ہاں ہوئی" ہرقل کہتا ہے فکیف کان قتالکم ایاہ آپ کے ساتھ تمھاری لڑائی کا کیا حال رہا؟ قلت الحرب بیننا و بینه سجال ینال منا و ننال منه ہم میں اور آپ میں لڑائی مثل ایک ڈول کے ہے، کبھی ہم نے کھینچ لیا اور کبھی آپ نے۔

(۱۰)

ماذا یامرکم۔ تمھیں کیا حکم دیتے ہیں؟ قلت یقول اعبدوا اللّٰہ ولا تشرکوا به شیئاً واترکوا ما یقول آباؤکم و یامرنا بالصلوٰۃ والصدق والعفاف والصلة۔ میں نے کہا کہ وہ کہتے ہیں کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور اُس کا کسی کو شریک نہ ٹھراؤ، اور تمھارے آبا و اجداد جو کہا کرتے تھے اسے چھوڑ دو اور ہمیں حکم کرتے ہیں کہ ہم نماز پڑھیں، سچ بولیں، پارسائی اختیار کریں، اقربا سے صلۂ رحم کریں۔

[1] نقض عہد۔ عہد شکنی، وعدہ خلافی [2] غدر۔ عہد شکنی (۲) بے وفائی

یہ ہیں وہ دس سوالات جو ہرقل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں کئے حضرت سفیان بن حرب اس کے راوی ہیں، انہیں سے خطاب تھا اور انہیں سے کلام باقی جماعت خاموش تھی، حضرت سفیان اُس وقت تک دولت اسلام سے مشرف نہیں ہوئے تھے بہ فتح مکہ میں ایمان لائے ہیں۔ اب جبکہ سوال و جواب ختم ہو چکے اور ہر جواب پر ہرقل نے اپنی رائے کا بھی اظہار کر دیا تو سب سے آخر میں تعلیمات محمدی کو پوچھتا ہے جو اس کا دسواں سوال ہے اور اس کا جواب پاکر یہ کہتا ہے :-

ان کان ما تقول حقا فسیملک موضع قدمی ھاتین وقد کنت اعلم انه خارج ولم اکن اظن انه منکم فلو انی اعلم انی اخلص الیه لتجشمت لقاءه ولو کنت عنده لغسلت عن قدمیه[1] یعنی یہ باتیں جو تم نے بیان کی ہیں اگر سچ ہیں تو عنقریب وہ شخص اُس جگہ کا مالک ہو جائیگا جو میرے قدموں کے نیچے ہے۔ میں نبی آخر الزمان کی بعثت کو تو جانتا تھا کہ ہونے والی ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ تم اہل عرب میں پیدا ہونگے۔ بہرحال اگر مجھے اُن کے پاس تک پہونچنے کی امید ہوتی تو میں اُن کی زیارت کے لئے ضرور مصائب سفر برداشت کرتا اور اگر میں اُن کے پاس ہوتا تو اُن کے قدم دھوتا۔

ایک غور طلب مسئلہ

مگر صحیح کہئیے ہرقل نے نہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علم و فن سے سوال کیا، نہ آپ کے خزینہ و دولت کو پوچھا، نہ لشکر و سپاہ سے استفسار کیا اور پھر کس سہولت سے فیصلہ کر دیا کہ بہت جلد وہ شخص قیصر کی سلطنت کا مالک ہو جائیگا۔ کس طرح اُس کے دل نے عظمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلیم کر کے عقیدت کا اظہار زبان سے کر دیا۔ اُس نے اُسی وقت سمجھ لیا تھا کہ جو ذات ان اخلاق سے متصف ہو اور جس کی تعلیمات ایسی زبردست ہوں اُس کے لئے ہر طرح کی کامیابی حتمی و یقینی ہے۔

ایک اور واقعہ

اب دوسرا واقعہ سنئے۔ سب سے پہلے غار حرا میں جب آپ پر وحی نازل ہوئی تو آپ نے مکان پر تشریف لاکر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا لقد خشیت علی نفسی مجھے اپنی جان کا خوف ہے اس وقت مجھے وحی کے معنی سمجھانے نہیں ہیں مجھے تو اس کے ایک حصہ سے سند لانی ہے اور وہ حضرت خدیجہ کا جواب ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمانے پر آپ نے دیا ہے :- قالت خدیجة کلا واللہ ما یخزیك اللہ ابدا انك لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق[2]۔ حضرت خدیجہ نے جواباً فرمایا، ہرگز نہیں

---

[1] صحیح البخاری، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، جلد اول، ص ۳، نور محمد اصح المطابع۔ کراچی طبع ثانی، ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء

[2] ایضاً، ص ۲

قسم اللہ کی اللہ تعالیٰ کبھی بھی آپ کو رسوا نہ کریگا آپ صلۂ رحم فرماتے ہیں اقربا کے حقوق ادا کرتے ہیں، یتیم عاجز و درماندہ[1] کی آپ غمخواری فرماتے ہیں اور لوگوں کو وہ چیزیں آپ عطا فرماتے ہیں جو سوا آپ کے کسی اور سے نہیں مل سکتی، مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں اور لوگوں کی حوادثات[2] حقہ پر مدد فرماتے ہیں۔"

اس حدیث کے ٹکڑے کو میں نے آپ کے سامنے صرف اس غرض سے پیش کیا ہے تاکہ آپ یہ دیکھیں کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو کس قدر اذعان[3] و اطمینان اس امر پر تھا کہ ایک ایسا شخص جس کی ذات میں یہ صفات پائے جاتے ہوں وہ ہرگز ہرگز ذلیل و رسوا نہیں ہو سکتا۔ یہ اعتقاد کیسا اچھا اور صحیح ہے۔ تم تمام ملک کی تاریخ پڑھ کر بھی ایک ایسا شخص نہ بتا سکو گے کہ جس میں عادات حسنہ صدق و راستی کے ساتھ پائے جاتے تھے اور وہ ذلیل و خوار ہوا ہو۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی شریر النفس ظالم نے ایسے شخص کو اپنے جفا و ستم کے راہ میں کانٹا تصور کیا ہو اور محض اپنے خبث باطنی سے اس پر مظالم کئے ہوں لیکن اس سے کیا ہوا۔ نہ تو ذرہ برابر اس کی عزت میں کمی آئی نہ اس کے اوصاف جمیلہ کا پایہ ہلکا ہوا، ہاں ظالم کی سیہ کاریوں میں ایک دھبہ البتہ بڑھ گیا۔

سنگِ بدگوہر اگر کاسۂ زریں شکند
قیمتِ سنگ نیفزاید و زر کم نشود[4]

حضرات! یہ ہے وہ ہدایت جس کی تعلیم کے لئے اللہ تعالیٰ نے رسول کی بعثت فرمائی یہ ہے وہ نور علم جس سے جہالت کی تاریکیاں مٹ جاتی ہیں، یہ ہیں وہ عادات جو انسان کو سچ مچ انسان بنا دیتی ہیں یہ ہے وہ دستور العمل جس سے ملک آباد اور دنیا رونق پذیر ہوتی ہے جب تک اس علم سے حصہ نہ پاؤ گے انسانی زندگی نصیب نہ ہوگی۔

ہست اسلام سیرتِ نیکو
نہ ہمی جامہ و قدِ دلجو[5]

جب علم کے پڑھنے سے خوف خدا پیدا نہ ہو معاصی کی برائیاں معلوم نہ ہوں جذبات پر قوت حاصل نہ ہو۔ وہ تعلق جو خدا سے ہونا ضروری ہے پایا نہ جائے تو پھر اسے علم حقیقی کیونکر کہا جائے گا۔ علم حقیقی تو وہی ہے جس کے پڑھنے سے خشیت ایزدی دل میں پیدا ہوتی ہے اور یہی کیفیت دل میں پیدا ہو کر علم و معاصی کے درمیان بطور پردہ کے حائل ہو جاتی ہے۔ اور یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک دربار رسالت سے لگاؤ نہ پیدا کر لیا جائے جس قدر دل میں یہ لگن بڑھتی جائیگی اسی قدر عبادات صحیح اور معاملات درست ہونگے۔

ایک بہترین قانون معاش و معاد | معاش و معاد کی جمع کرنیوالی دین و دنیا کو مزین کرنیوالی

1 درماندہ۔ بے کس، مجبور، عاجز، ناچار 2 حوادثات (حادثہ کی جمع الجمع) حادثے، مصیبتیں، تکلیفیں، زمانہ کی گردشیں 3 اذعان۔ یقین/ بھروسا/ اعتماد کرنا (۲) اقرار کرنا (۳) اطاعت کرنا، حکم ماننا 4 "گھٹیا پتھر اگر سونے کا پیالہ توڑ ڈالے تو (اس عمل سے) نہ تو پتھر کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے، نہ سونے کی قدر و قیمت کم ہوتی ہے۔" 5 "اسلام اچھی سیرت کا نام ہے، خوب صورت لباس یا دلکش قد و قامت کا نہیں۔"

بجز تعلیم رسالت اور کوئی تعلیم روئے زمین پر پائی نہیں جاتی اس خاکدانِ¹ عالم میں وہ شمع (جس کے انوار میں دین و دنیا کی حسنات دکھلائی دیں) وہ بجز شمعِ نبوت کوئی دوسری شمع نہیں ہے۔ یہ نہ صرف دعویٰ اور دل خوش کن باتیں ہیں بلکہ واقعات و حقائق ہیں۔ اسلام سے پیشتر اور اسلام کے مابعد بھی غیر مسلمین میں تم کو اس امر کے شواہد ملینگے کہ باوجود علم و فضل پھر بھی یا دنیا ان پر سرا پا چھا گئی یا دین کے سمجھنے میں ایسے اغلاط ان سے ہوئے کہ جس سے دین ایک ہولناک اور ناممکن العمل ہو گیا۔ مثلاً بعضوں نے قوائے فطری کو معطل و بیکار کر دینا انتہائے کمال سمجھا۔ ایسی جماعت کو اصطلاح میں ناسک کہتے ہیں ان میں سے کسی نے اپنا ہاتھ اتنے عرصہ دراز تک اُٹھائے رکھا کہ اس میں جھکنے کی طاقت اور گرفت کی قوت باقی نہ رہی۔ کسی نے خاموشی اختیار کر لی اور نطق² کو طلاقت³ تو نے سمجھ کر چپ سادھ گئے۔ کسی نے طول قیام سے قدم کے اعصاب خشک کر دیئے اور اس کو مجاہدہ و ریاضت سے تعبیر کیا کسی نے رہبانیت³ کو پاکبازی سے موسوم کیا۔ کسی نے دشت و جبل کو اپنا مسکن بنایا۔ غرض اس طرح کے خیالات اس جماعت کے ہوئے جنھوں نے دنیا میں آکر اور رہ کر دنیا کے جائز تمتع سے بھی بہرہ مند ہونا اتقا و تقدس کے منافی جانا۔ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ⁴ کو نظر انداز کر دیا یعنی ان سے یہ تو کہو کہ اللہ نے جو یہ اشیا اپنے بندوں کے لئے پیدا کی ہیں انھیں حرام کس نے کر دیا) اس جماعت کے برعکس ایک دوسرا گروہ ہے جس نے بجز حیاۃ دنیا اور کچھ نہ جانا۔ بہتر سے بہتر مکان میں رہنا، عمدہ سے عمدہ غذا کھانا، خواہشاتِ نفس بلا لحاظ جا و بیجا جس طرح ہو سکے پورا کرنا، دولت جس ذریعہ سے ممکن ہو سمیٹنا اپنی زندگی کا ثمرہ قرار دیا۔ اسے اصطلاح میں لذتیہ کہتے ہیں ان کے نزدیک انسانی زندگی بس تمتعات دنیا سے بہرہ مند ہونیکا نام ہے۔ لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ⁵ سے غافل ہے یعنی اللہ کی یاد سے اولاد و مال تمھیں غافل نہ کرنے پائے۔

اب اس افراط و تفریط کے مقابلہ میں اسلام کی تعلیمات کی طرف توجہ کرو حکم ہوتا ہے وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا⁶ (جو حصہ تیرا دنیا میں مقرر کر دیا ہے اُسے نہ بھول) جائز وسائل و پاک ذرائع سے جس قدر ہو سکے وہ سب انسان کا حصہ ہے اُسے حاصل کرنا چاہئے لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ اسی حصے کی طلب میں انسان اپنی عمر کا تمام زمانہ بسر کر دے اس لئے یہ ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ⁷ (ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنھوں نے خدا کو فراموش کر دیا۔ پھر اللہ نے بھی اپنی رحمت سے انھیں بھلا دیا اور خدا کا بھول جانا تو نافرمانوں کا شیوہ ہے) دیکھئے اصلاح معاش و فلاح معاد کے لئے

¹ خاک دان۔ مٹی اور کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ (۲) (مجازاً) دنیا ² نطق۔ بولنا، بات کرنا (۲) بولنے کی طاقت، گفتگو (۳) تقریر، لکچر، خطبہ۔
³ رہبانیت۔ راہبوں کی طرح عبادت، دنیا چھوڑ دینا (۲) جائز لذات کو رضائے الٰہی کے لیے چھوڑ دینا (۳) عیسائی عابدوں کا ترک لذات اور زہد و پرہیزگاری کرنا۔ ⁴ الاعراف: ۳۲ ⁵ المنفقون: ۹ ⁶ القصص: ۷۷ ⁷ الحشر: ۱۹

کے لئے کیسے زرّیں اصول بتا دیئے گئے۔ تمام دن و رات اپنا کاروبار محنت و راحت کیا کرو۔ لیکن جب نماز کا وقت آجائے تو چوبیس گھنٹے میں سے تھوڑا تھوڑا وقت یادِ اللہ میں بھی صرف کیا کرو جس کی دی ہوئی نعمت کھاتے ہو جس کے عطا کردہ قویٰ[۱] سے کام لیتے ہو اُس کی بھی تو شکرگزاری چاہئے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہی کا صدقہ ہے کہ دین و دنیا دونوں ہمیں نصیب ہوئے۔ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ[۲] تعلیماتِ محمدی کا ایسا برزخ بیچ میں حائل ہے جس کی وجہ سے دنیا ہمارے دین کو تباہ نہیں کر سکتی اور دینداری ہمیں دنیا میں بہرہ مند ہونے سے مانع آسکتی ہے ان باتوں کو سوچو غور کرو تو تمہیں اپنے مذہب کی قدر معلوم ہوگی پھر تمہیں اس سے تغافل[۳] کرنے پر ندامت ہوگی جس کا نتیجہ تمہارے لئے فرحت بخش ہوگا۔ حدود و اوامر میں رہ کر جس قدر دنیا کی نعمتیں حاصل کر سکتے ہو اطمینان سے کرو۔ اطاعت و عبادت کے ساتھ جس قدر چین و آرام تمہیں مل سکے اُس سے ہرگز محروم نہ رہو۔ یہ کوئی اتقاء و پرہیزگاری نہیں ہے بلکہ مکر و فریب ہے۔ اسی طرح یہ نفس کا دھوکا ہے جس نے تمہیں اہلِ زمانہ کی کورانہ[۴] تقلید کو آراستہ و پیراستہ کرکے ایک دلفریب شکل میں لاکر کھڑا کر دیا ہے جسے تم کبھی علم کی شان سمجھتے ہو اور کبھی شرافتِ انسانی اُس کا نام رکھتے ہو اور کبھی حیاتِ اجتہادی و حریت سے اسے موسوم کرتے ہو اور کبھی روشن دماغی و وسیع الخیالی اُس کا عنوان قائم کرتے ہو۔ ایک مرتبہ سچے دل سے لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم پڑھ کر اپنے اصلاح کی طرف جھک پڑو ہدایتِ خداوندی تمہیں لبیک کہتی ہوئی خود اپنے آغوش میں لے لیگی اُس وقت تمہیں حقیقی شرافت و سچی حریت نصیب ہوگی بسم اللہ پڑھ کر اٹھو اور اس تمام آلودگی سے اپنے دامنِ عزت کو صاف کر ڈالو۔

دلا تا کے دریں کاخِ مجازی — کنی مانند طفلاں خاک بازی
بیفشاں بال و پر ز آمیزشِ خاک — بہ پر تا کنگرۂ ایوانِ افلاک[۵]

دیکھو آزادی کے معنی ہم تمہیں بتلائیں ذرہ ٹھنڈے دماغ سے فرصت کے وقت اسے سوچنا۔

خلافِ فطرت آزادی

انسان اگر اپنے اقوال و افعال میں اس طرح آزاد ہونا چاہے کہ جو منہ میں آئے کہے جائے اور جس طرح جو چاہے کئے جائے تو ایسی آزادی قطع نظر نفرت انگیز ہونے کے یقیناً محال و ممتنع[۶] الوجود ہے۔ اب لامحالہ کسی قواعد و اصول کا پابند ہو کر کچھ کہیگا یا کریگا اُس کے قول و فعل کا ایک دائرہ محدود ہوگا اور اُس کے وسعت کی ایک حد ہوگی اب ذرا اسے سوچو کہ محدود دائرہ میں جو کچھ کہ ایک انسان کہہ سکتا ہے یا کر سکتا ہے کیا اُس کے وہ قول و فعل آزاد ہیں۔ ایک غائر نظر اس کا

۱ قُویٰ (قوت کی جمع) قوتیں، طاقتیں ۲ الرحمٰن: ۱۹و۲۰ ۳ تغافل۔ جان بوجھ کر غفلت کرنا (۲) بے پروائی، بے التفاتی، کم توجہی (۳) تساہل، سستی ۴ کورانہ۔ اندھوں کی طرح ۵ "اے دل اس مجازی محل (دنیا) میں کب تک بچوں کی طرح خاک بازی کرتے رہوگے۔ مٹی کی آمیزش/وابستگی سے بال و پر جھاڑو اور آسمانوں کے ایوان کے بام تک اڑان بھرو۔" ۶ ممتنع۔ منع کیا گیا، باز رکھا گیا، روکا گیا۔

جواب تمھیں نفی میں دیگی اس لئے کہ صدور قول و فعل خیالات کے بندشوں میں جکڑے ہوئے ہیں پہلے ایک شے دماغ میں آتی ہے پھر قوتِ متخیلہ[۱] اس پر غور کرتی ہے اس کے بعد ان خیالات کا اظہار اقوال و افعال سے کیا جاتا ہے حکما کا قول ہے کہ اگر کسی کے خیالات کی بلندی و پستی مطالعہ کیا چاہو تو اس کے کلام و حرکات و سکنات پر متجسسانہ[۲] نظر ڈالو اس لئے کہ اعمال و افعال صور خیالیہ کے آئینہ ہیں اس سے یہ امر تو واضح ہو گیا کہ قول و فعل آزاد نہیں بلکہ خیال کے پابند ہیں اب آو خیال کو دیکھیں[۳] اس کا کیا حال ہے ایک دقیق نگاہ اسکو بھی معلومات کا تربیت کا صحبت کا رسم و رواج کا مقتضیات[۴] ملک وغیرہ وغیرہ کا معتقد پاتی ہے۔ جو خیال کہ انسان کے دماغ میں آتا ہے وہ نتیجہ ہے اس کی معلومات کا یا اس سوسائٹی کا جس میں اس نے نشو و نما پایا ہے یا ملک کی رسم و رواج نے یہ خیال پیدا کر دیا ہے۔ یا گرد و پیش کے واقعات کا اثر ہے۔ غرض انہیں چیزوں سے خیال متاثر ہوتا رہتا ہے اور ان کے قیود سے نکل نہیں سکتا۔ الحاصل جب اقوال و افعال خیالات کے تابع ہوئے اور خیالات معلومات و تربیت و سوسائٹی وغیرہ کے قید خانہ میں مقید رہے تو پھر آزادی کا نام ایک ایسا عنوان ہے جس کا معنون[۵] نہیں۔ ایسا لفظ ہے جس کا خارج میں وجود و معنی نہیں۔ اب سوچئیں پر فیصلہ ٹھہر الحمیں کہ خدا لگتی کہو ہم اپنے خیالات کو تعلیمات و صحبت و طرز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیوں متبع نہ بنائیں کیا مدینۃ العلم کی تعلیم کے سوا کوئی دوسری تعلیم حکومت کرنے کے لئے زیادہ سزاوار ہے؟ کیا اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ[۶] کی تربیت سے کوئی تربیت زائد ہمیں حریت بخش ہے؟ ہرگز نہیں کبھی نہیں سے

خلاص حافظ ازاں زلفِ تابدار مباد
کہ بستگانِ کمندِ تو رستگارانند[۷]

تعلیم نبوی کا معجزنما نتیجہ

یہ کوئی امر اعتقادی نہیں بلکہ واقعی ہے کہ تاجدار مدینہ نے محض اپنے دامنِ تربیت میں عرب جیسے جاہل و وحشی قوم کو لیکر چند دنوں میں کمالات کا مجسمہ بنا دیا اور دنیا کے لئے اپنی تعلیم و تربیت و صحبت کا ایک بے نظیر نمونہ چھوڑ گئے جو شخص عرب کے اس انقلاب کی طرف دیکھتا ہے سر دھنتا ہے۔ دماغ اس کا چکر میں آجاتا ہے اور یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ دم کے دم میں تاریکی روشنی سے جفا وفا سے قطع وصل سے فساد صلح سے عداوت محبت سے ذلت عزت خیانت امانت سے معصیت طاعت سے کدورت[۸] صفائی سے بدل کر دنیا کا رنگ ہی پلٹ دیا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ بارک وسلم ہی تھی وہ ہدایت جس کے لئے دنیا پیاسی تھی اسی آبِ حیات[۹] کا ذکر ہے اس آیۂ کریمہ میں هُوَ الَّذِي

---

۱ قوتِ متخیلہ۔ خیال میں لانے/سوچنے کی قوت، قوتِ خیال، خیال پیدا کرنے کی طاقت (۲) وہ طاقت، جو صور قبولہ کو غائب میں محفوظ رکھتی ہے۔
۲ متجسسانہ۔ تحقیقی، بطور جستجو ۳ بقول پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد: خیال کی عظمت سے کسے انکار ہے؟ قوموں کی آبادی و بربادی اسی خیال کی کج روی و راست روی پر منحصر ہے۔ ۴ مقتضیات۔ تقاضا کیے گئے، چاہے گئے، خواہش کیے گئے (۲) (مجازاً) مراد، مطلب (۳) موقع (۴) مصلحت ۵ معنون۔ عنوان کیا ہوا/کیا گیا/لکھا گیا دیباچہ کیا گیا/ابتدا کیا گیا/ڈیڈیکیٹ کیا گیا (۲) کسی کے نام سے منسوب کیا گیا، نامزد کیا گیا۔ ۶ "بلاشبہ آپ یقیناً بہت بڑی شان والے خلق پر ہیں"۔ (القلم ۴) ۷ "اُن پیچ دار زلفوں سے حافظ کی خلاصی کبھی نہ ہو کیوں کہ جو اس کمند میں بندھے ہوئے ہیں، وہی نجات یافتہ ہیں۔"
۸ کدورت۔ گدلا پن، تیرگی، آلودگی، رنجش ۹ آبِ حیات۔ آبِ بقا، زندگی کا پانی، ہمیشہ کی زندگی بخشنے والا پانی، وہ پانی جس کو پی کر کبھی موت نہیں آتی۔

أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا[1]۔ اس قدر بیان جو توحید و رسالت و تعلیمات اسلامی کے متعلق ہوا، اس سے غرض یہ تھی کہ قرآن پاک کی عظمت بربان وجہت کے پہلو سے آپ حضرات کے سامنے پیش کروں تاکہ ارباب استدلال کو یہ معلوم ہو جائے کہ مذہب کا بازو اس حیثیت سے بھی بہت قوی ہے۔ اگر منصفانہ نگاہ سے کوئی قرآن کی تلاوت سمجھ کر کر جائے تو بیش بہا جواہر اس کے خزائن اُسے ہر سورہ میں ملیں گے۔ میں نے تو صرف طالب ہدایت کے لئے ایک طریقہ بیان کر دیا ہے۔

اب فقیر کے تقریر کا صرف ایک حصہ باقی رہ گیا ہے جس کے پورا کرنے کے بعد میں اپنے ایفائے عہد سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔ اور وہ حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال میں ہوگا جس سے آپ کا خاتم النبیین ہونا واضح و اجلیٰ ہو جائیگا۔ گو مسئلہ رسالت کی بحث میں بحث رسول بھی متضمن[2] ہے لیکن اپنا دل یہی چاہتا ہے کہ اسے ایک مستقل عنوان قرار دوں۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم

احتیاج نصب العین

انسان جس طرح ایک کامل و جامع دستور العمل کی طرف محتاج ہے اسی طرح اُسے اس کی بھی حاجت ہے کہ کوئی ذات اُس کی نگاہ کے سامنے ایسی ہو جس کی عملی زندگی اعلیٰ تشریح و تفصیل دستور خداوندی کی ہو۔ جس کی خلوت و جلوت کی باتیں جس کے حرکات و سکنات جس کا خور و خواب خدا کے فرمان کے بموجب ہو اور اُس کی ذات پر وہ تمام واقعات گذر گئے ہوں جن سے انسان کا دوچار ہونا لابد[3] ہے۔ تاکہ اُس کی زندگی کے تمام شعبہائے حیات ہمارے لئے ایک عمدہ نمونہ بنکر رہبری کرنے والے ہوں اور ہم کسی امر میں کسی دوسرے کے محتاج نہ ہوں۔

ایک جامع کمالات ذات

تواریخ عالم کے جاننے والوں سے یہ امر مخفی نہیں کہ دنیا میں کوئی ایسی ذات جو ہر طرح کے کمالات کی جامع ہو بجز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پائی نہیں جاتی۔ اس میں شک نہیں کہ مختلف قرون میں مختلف باکمال اشخاص سے دنیا رونق گیر رہی ہے کسی میں شجاعت کا جوہر تھا اور کسی میں علم و کرم کا وصف کوئی ان باکمالوں میں سلطان ذی جاہ تھا اور کوئی تمام تعلقات سے علیحدہ ہو کر فانی فی اللہ باقی باللہ کا مجسمہ۔ لیکن وہ ذات جو تمام کمالات کا مجموعہ ہو وہ تو صرف اُسی تاجدار مدینہ کی ذات ہے۔ شریعت کی تعلیم اُسی اُمت نواز سے تھی۔ تزکیہ[4] نفس اُسی روح پرور کے انفاس قدسیہ سے تھا۔ میدان جنگ میں وہ ایک بڑے سپہ سالار کی صورت میں دکھائی دیتا۔

---

۱ الفتح: ۲۸ ۲ متضمن۔ مشتمل، شامل، مشمول، داخل، مندرج (۲) ملا ہوا، ضمن میں لینے والا/لیا ہوا۔ ۳ لابد۔ قطعی، یقیناً، بے شک (۲) مجبوراً، ناچار، ناگزیر، ضرور بالضرور ۴ تزکیہ۔ پاکی، صفائی، پاک کرنا، صاف کرنا۔

انتظامات ملک میں ایک بڑا مدبر سلطان تھا۔ نزاعات[1] باہمی و مناقشات[2] کو فیصل کرنے میں ایک بے نظیر حاکم عادل
تھا۔ پھر باوجود ان تمام کمالات کے صبر، بردباری، عفو، تواضع، حیا، مروت، سخا، وقار، حفظ مراتب صحبت
ان سب اوصاف کا اعلیٰ وجہ الکمال ایک مرقع[3] تھا۔ آپ رحمۃ للعالمین کا وجود صحابہ کرام کے لئے گوناگوں[4] کمالات
کا ایک سلسلۃ العلوم تھا جس کی زندگی کا ہر صفحہ ایک مصور رسالہ تھا اور صحابہ کرام آپ کے مطالعہ میں ہمہ تن مصروف
تواریخ میں تم پڑھو گے کہ وہ لوگ جن کے دل کا لگاؤ حرب و ضرب سے ہوتا ہے جب میدان کارزار میں اترتے
ہیں تو دشمن کے لئے بجز برش[5] شمشیر و نوک سناں ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم
نے اپنے عمل سے یہ سبق اپنے اصحاب کو پڑھایا کہ ایسے سخت ہیجان و جوش میں بھی جذبہ مروت[6] کو ضائع نہ کریں
ایک واقعہ سنو جنگ بدر کے وقت کفار کی جماعت میں ایک کافر ابوالبختری بھی آتا ہے۔ بمقابلہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم (اس وقت جبکہ آپ مکہ معظمہ میں تشریف فرما تھے اور کفار طرح طرح کی اذیتیں آپ کو دیتے اور اشاعت
اسلام میں گوناگوں رکاوٹیں پیدا کرتے تھے) ابوالبختری نے سکوت سے کام لیا تھا اس کی صرف اس قدر
رعایت کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور خیال تھا۔ کہ اس حال میں جبکہ کفار کے ساتھ وہ بھی لڑنے کو
آیا ہوا تھا۔ آپ نے اصحاب کو یہ ہدایت فرمائی کہ اگر ابوالبختری کا مقابلہ ہو جائے تو اسے قتل نہ کرنا بلکہ زندہ میرے
پاس لاناں وکپڑے آنا اس لئے کہ وہ قیام مکہ کے وقت میرے آزار کا موجب نہ ہوا تھا۔ یہ ایک بیش بہا مروت
کی مثال آپ نے جنگ کے وقت دشمن کے مقابلہ میں قائم فرمائی۔ دوسرا واقعہ سنو۔ جنگ بدر میں جبکہ کفار کو شکست
ہوئی اور ستر قیدی اسیر لائے گئے تو ان میں ایک حضرت عباس عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے۔
قیدیوں کی مشکیں کسی ہوئی تھیں۔ آنحضرت کا خیمہ قیدیوں سے قریب تھا۔ حضرت عباس بندش کی سختی سے
کراہتے۔ رحمۃ للعالمین کا دل مضطرب ہو گیا۔ حکم فرمایا کہ عباس کے بند کھول دیے جائیں اس کے ساتھ ہی حکم ہوا
کہ جتنے قیدی ہیں سب کے ہاتھ کھول دو۔ کسی کی مشکیں نہ بندھی رہیں۔ یہ دوسرا سبق رحمت و شفقت کا ہے
فاتح قوم کو یہ درس دیا گیا کہ مفتوح اشخاص کو اپنے فاتحانہ جوش کا مشق نہ بناؤ۔ مہربانی و شفقت کو دشمن
سے بھی دریغ نہ رکھو۔

مال صادق سے کام لو تو یہ خصلت و عادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمیں ایک معجزہ معلوم
ہوگی۔ مرتبہ انبیاء جلیل الشان کہ خاتم النبیین اللہ تعالیٰ نے فرمادیا۔ آپ کے بعد دوسرا نبی یا رسول ہونا محال
و ممتنع بالذات۔ رسالت ایسی عامہ و تامہ کہ تمام دنیا کا رسول بنا کر اللہ نے بھیجا لیکن اس پر تواضع و انکساری

۱ نزاعات (نزاع کی جمع) جھگڑا، تنازع، کھینچ تان، کشاکش، خصومت، تکرار (۲) دشمنی، بیر، عداوت (۳) فساد، فتنہ، قضیہ ۲ مناقشات (مناقشہ کی جمع) باہمی لڑائی جھگڑا، نزاع، قصہ، فتنہ، قضیہ ۳ مرقع۔ تصویروں کی کتاب، البم (۲) قطعات رکھنے کی کتاب (۳) (کنایۃً) لاجواب۔
۴ گوناگوں۔ رنگ برنگ، طرح طرح کا، رنگا رنگ، طرح بطرح ۵ برش۔ کاٹ، تیزی، کاٹنا ۶ مروّت۔ بہادری، مردانگی، مردی، جواں مردی (۲) خلق، اخلاق، انسانیت، آدمیت (۳) (مجازاً) احسان۔

کا یہ عالم کہ شکستہ حالوں میں مل کر بیٹھ جاتے اور فرماتے مسکین جالس عند المساکین[1] (ایک مسکین ہے جو مسکینوں میں بیٹھا ہوا ہے) تہذیب ایسی ارفع و اعلیٰ کہ تمام عمر نہ کوئی فحش کلمہ زبان پر آیا نہ کسی کو کبھی گالی دی کسی ذاتی امر کے لئے نہ تو کبھی غصہ فرمایا نہ کسی کام کا اپنی ذات کے لئے حکم فرمایا۔ ان امور کی قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جبکہ اُس کے بلندی رتبہ کو ذرا لحاظ کرو۔ اللہ تعالیٰ یوں حکم دیتا ہے۔ لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ[2] (یعنی نبی کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو اور نہ اُسے اس طرح پکار دجیسا کہ آپس میں ایک دوسرے کو پکارا کرتے ہو) صحابہ کی حالت یہ کہ دربار رسالت میں اس طرح مودب بیٹھتے تھے کہ جسم میں حرکت تک نہیں ہوتی تھی گویا کہ اُن کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ مگر اس پیغمبر کی ذرہ نوازی و وسعت اخلاق یہ کہ ہر ایک کی دل دہی و دل جوئی ہو رہی ہے ایک مرتبہ دربار رسالت آراستہ ہے۔ مجلس میں اس کثرت سے صحابہ حاضر ہیں کہ کہیں جنبش تک کی جگہ باقی نہیں ایسے وقت میں ایک اعرابی آتا ہے ادھر اُدھر دیکھ کر صف نعال[3] میں بیٹھ جاتا ہے حضور سے جو اس قدر دور جگہ پائی تو اس سے شکستہ خاطر ہوتا ہے فوراً اخلاق محمدی بڑھ کر اُس شکستہ دل کی خبر لیتا ہے آنحضرتؐ نے اپنی ردائے[4] مبارک اُس کی طرف پھینکی اور فرمایا اے شخص تو اس کو بچھا کر وہاں بیٹھ جا۔ اب دیکھو اگر ایک شخص دولت قرب سے مالا مال ہے تو صف نعال کا بیٹھنے والا بھی اپنا دماغ اُس کے ہم پلہ پاتا ہے کہ میرے پاس وہ چادر ہے جو جسم اطہر سے لپٹی رہتی ہے۔

اس قوت و رعب کے ساتھ عدل کا ایسا خیال کہ جنگ بدر کے موقع پر آپ اصحاب کی صفیں مرتب و مسلسل فرما رہے ہیں۔ سواد بن غزیہ ذرا صف سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ایک تیر بغیر پیکان[5] کے ہے جس سے آپ صفوں کو سیدھا فرما رہے تھے۔ سواد کو صف سے نکلا ہوا دیکھ کر آپ نے تیر کی لکڑی سے ایک کوچہ[6] اُن کے پیٹ میں دیکر فرمایا کہ صف میں داخل ہو۔ حضرت سواد صف میں داخل ہو گئے اور عرض کیا یا رسول اللہ آپ نے مجھے تکلیف پہنچائی اس کا عوض دیجئے معاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کرتہ شکم مبارک سے اٹھا لیا اور فرمایا کہ عوض لے لو حضرت سواد نے شکم مبارک کو بوسہ دیا اور لپٹ گئے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کیا بات ہے۔ سواد عرض کرتے ہیں کہ آج کا معرکہ سخت ہے تھوڑے دیر میں دشمن سے دست و گریبان ہونگے ہو سکتا ہے کہ یہ وقت میری زندگی کی آخری ساعت ہو۔ اس لئے میری تمنا تھی کہ میرا بدن آپ کے جسم مقدس سے اس طرح ایک دفعہ مل جائے کہ کوئی کپڑا وغیرہ بیچ میں حائل نہ ہو۔

[1] یہاں الخطاب میں مفہوماً کہا گیا۔ آپ کا ارشاد گرامی ہے۔ اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا (اے باری تعالیٰ مجھے مسکینوں میں زندہ رکھ)۔ ترمذی شریف رقم الحدیث ۲۳۵۲، دارالسلام۔ ریاض، طبع ۲۰۰۰ء ــــ اسلام کا آغاز غربت کے عالم میں ہوا اور عنقریب وہ غربت کی طرف لوٹ جائے گا (پس خوش خبری ہے غرباء کے لیے)۔ الحدیث [2] الحجرات: ۲ [3] نعال (نعل کی جمع) جوتے، پاپوش [4] رداء۔ اوڑھنے کی چادر [5] پیکان۔ تیر، برچھی، بھالے یا نیزے کی نوک / انی [6] کوچا، کوچا۔ نوک دار چیز بھونکنا، کسی نوک دار چیز کا تھوڑا سا زخم، کچوکا۔

یہی آخری توشہ[۱] اس عالم سے میرا ہوگا۔ آپ یہ سن کر انھیں دعائے خیر فرمائی۔ ع زجرمے کز کمالِ عشق خیزد + کجا معشوق با عاشق ستیزد[۲]۔ اس کشادہ دلی و عدل کی نظیر پیش کرنے سے تاریخ اقوام عاجز ہے۔ اپنی عملی زندگی سے اس طرح اخلاق، شفقت، رحم، مروت، عدل کا سبق دنیا کو کس نے دیا، یہ مضمون جس قدر کہ وسیع ہے اسی قدر دلکش بھی ہے مگر افسوس ہے کہ فقیر حسب دلخواہ بیان کرنے سے قاصر ہے۔ آپ حضرات بھی اس وقت معاف فرمائیں۔ کیا کہا جائے ع دلم خزینۂ اسرار بود دست قضا + درش ببست و کلیدش بدلستانی داد[۳]

غایت کمال انسانی

اب صرف ایک واقعہ مختصر چند جملوں میں گزارش کروں گا جس سے طرح طرح کے کمالات محمدی آپ کو معلوم ہونگے اور وہ واقعہ فتح مکہ کا ہے۔ مکہ معظمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاتحانہ داخل ہوتے ہیں۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں لوگوں نے اپنی اذیت رسانی سے چین کی سانس لینی دشوار کر دی تھی۔ بالآخر خدا کے بیت معظم سے اللہ کے رسول کو جدائی اختیار کرنی پڑی۔ قوم نے اس وقت نہ تو قرابت کا لحاظ کیا تھا نہ شرافت خاندانی نظر میں لائی تھی نہ آپ کے اخلاق کریمانہ کا کچھ پاس کیا تھا جب آپ ہجرت فرما کر مدینہ طیبہ میں تشریف فرما ہوئے تو وہاں بھی اطمینان سے بیٹھنے نہ دیا۔ برابر مدینہ پر چڑھ چڑھ کر گئے اور متعدد بار اللہ کے حبیب کے مقابل ہوئے۔ غزوۂ بدر، غزوہ احد، غزوہ خندق وغیرہ وغیرہ اس کے شاہد ہیں۔ رسول اللہ صلعم اپنے خالق کی عبادت ادا کرنے کی غرض سے تشریف لاتے ہیں۔ وعدہ فرماتے ہیں کہ صرف عمرہ ادا کر لینے دو فوراً مدینہ کو واپس چلا جاؤں گا۔ کسی امر سے یا کسی شخص سے کسی طرح کا تعرض[۴] نہ کروں گا۔ مگر اہل مکہ نہیں مانتے ہیں۔ آج اللہ تعالیٰ فتح عطا فرماتا ہے۔ شیاطین کے تخت الٹے جاتے ہیں توحید کے سر پر سرآرائی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حبیب دس ہزار مجاہدین کی جمعیت سے داخل مکہ معظمہ ہوتا ہے۔ مجاہدین اس شان سے داخل ہوتے جاتے ہیں کہ ہر قبیلہ اپنا علم ہاتھ میں لئے ہوئے اپنے سردار کے ساتھ ہے۔ ایک ایک قبیلہ ترتیب سے گزرتا جاتا ہے۔ تکبیر و تہلیل کے دل کپکپا دینے والے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ سب کے بعد تاج الانبیاء فخر الرسل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی جماعت کے ساتھ گزرتے ہیں جن میں مہاجرین و انصار ہیں۔ بیچ میں آنحضرتؐ کا ناقہ ہے اور اس کے گرداگرد جاں بازوں کا حلقہ۔ سب کا لباس سبز ہے تمام و کمال اسلحہ جنگ سے مرصع ہیں خود و زرہ نے تمام بدن چھپا رکھا ہے بجز آنکھوں کی پتلی کے اور کوئی حصہ جسم بھی ہتھیار کے شیروں کا دکھلائی نہیں دیتا اس شان حق کو دیکھ کر عرب کے بہادروں کے دل دہل گئے کلیجہ کانپنے لگا۔ جب آنحضرتؐ مقام ذی طویٰ پر تشریف لائے تو کچھ توقف کیا۔ عہد سابق یاد آ جاتا ہے۔ کفار کے مظالم کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔

۱ توشہ۔ زادِراہ، راستے کا خرچ ۲ "ایسے جرم کی پاداش میں جو عشق میں انتہا کی وجہ سے سرزد ہوا ہو، معشوق اپنے عاشق سے کہاں لڑائی کرتا ہے۔" ۳ "میرا دل اسرار کا خزینہ تھا موت کے ہاتھوں نے اس کا دروازہ بند کر دیا اور اس کی چابی کسی دلربا کو دے دی۔"

۴ تعرض۔ مزاحمت کرنا، روکنا، مائل ہونا (۲) روک ٹوک، مزاحمت (۳) پیش آنا اور بے ہودہ تنگ کرنا (۴) اعتراض کرنا۔

اب بجائے اس کے کہ جوشِ انتقام دل میں اٹھتا یا علو و افتخار نفس میں پیدا ہوتا نہایت تذلل[1] و انکسار سے ناقہ کے کجاوہ پر چادر کا کونہ ڈالکر سربسجود ہو جاتے ہیں۔ خدا کی جناب میں جبہ سائی[2] ہے اور اس کے فضل و کرم پر شکر گزاری۔ سعد بن عبادہ کے منہ سے جوش میں یہ کلمہ نکل جاتا ہے کہ آج کعبہ کی تاخت و تاراج[3] حلال ہوگی فوراً انھیں اس کہنے سے روکا جاتا ہے اور ان سے جھنڈا لیکر انھیں تو لشکر میں داخل اور جھنڈا حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہ کے حوالہ فرمایا جاتا ہے۔

عجز و انکسار اس فتح و قوت پر تو دیکھ چکے اب ذرا اس مقام کو دیکھو نقیب و منادی ہر طرف پھیل گئے ہیں۔ پکارتے جاتے ہیں کہ جو مسجد حرم میں داخل ہو جائے اسے امان ہے۔ جو سفیان کے گھر میں چلا جائے اسے امان ہے جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے اسے امان ہے جو ام ہانی کے مکان میں داخل ہو اسے امان ہے۔ جو ہتھیار ڈال دے اسے امان ہے۔ غرض ایک امان کی صدا تھی جو در و دیوار سے گونج رہی تھی۔ اس رحمت و کرم کو دیکھ کر کفار مشرکین کا دل بھی امنڈ آیا۔ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوہِ صفا پر رونق افروز ہو کر بیعت اسلام لیتے اور ہدایت کی جامع نصیحت فرماتے۔

اسی حالت میں ہندہ زوجہ ابوسفیان جس کے کفر و غیظ کی شدت اس سے ظاہر ہے کہ حضرت حمزہ عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کچا کلیجہ اس نے چبایا تھا حاضر خدمت اقدس ہوئی ہے مسلمانوں کے خوف سے تمام جسم چادر میں لپیٹ لیا تھا کہ مبادا کوئی پہچان کر حضرت حمزہ کی بیحرمتی کے عوض کہیں قتل نہ کروا دے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رحم پر اس قدر اطمینان تھا کہ جب سامنے پہونچی تو نقاب رخ سے اٹھا دیا اور عرض کیا کہ میں ہندہ زوجہ ابوسفیان ہوں۔ آپ کو اپنے چچا کی حالت یاد آگئی۔ اس کی جانب سے منہ موڑ لیا۔ اس نے فوراً "اشہد ان لا الٰہ الا اللہ و اشہد ان محمداً عبدہ و رسولہ" باواز بلند پڑھا۔ کلمہ طیبہ کا اس کی زبان سے نکلنا تھا کہ سارا ملال دل سے جاتا رہا۔ یہ ہے جوش انتقام۔ صاحبو! ان واقعات کو قصہ کی طرح نہ سنئے۔ سوچئے غور کیجئے کہ کیا فاتحانہ جوش اسی کا مقتضی[4] تھا کہ امان امان کی صدا پکار دی جائے۔ لوگوں کے مکانات و متاع و آبرو سے کچھ تعرض[5] نہ کیا جائے۔ انتہا یہ کہ اگر جوش میں بھی کوئی جملہ منہ سے کسی کے نکل تو اس سے آزردہ ہوں۔ ایک ایسی قوم پر جس نے مدتوں مشق ستم مسلمانوں کو بنائے رکھا ہو یہ الطاف و کرم کئے جائیں۔ نہ فتح سے نفس متلذذ[6] ہوتا ہے نہ اس شوکت و غلبہ پر کچھ فخر کرتا ہے۔ وہی نیاز و سجود ہے اور وہی عبادت۔ نہ دعوت کے جلسے ہیں نہ جشن کی مجلسیں نماز کا وقت ہوتا ہے حضرت بلال اذان دیتے ہیں اور

[1] تذلل۔ نرم ہونا، عاجزی کرنا، فروتنی کرنا [2] جبہ سائی۔ ماتھا، پیشانی رگڑنا، سجدہ کرنا [3] تاخت و تاراج۔ برباد، تہس نہس، ستیاناس کرنا، حملہ کر کے تباہ کر دینا [4] مقتضی۔ تقاضا کرنے والا، چاہنے والا، خواہش کرنے والا، خواہاں [5] تعرض۔ پیش آنا، درپے ہونا (۲) چھیڑنا، تنگ کرنا (۳) اعتراض کرنا (۴) مزاحمت کرنا، روکنا، حائل ہونا [6] متلذذ۔ لذت اٹھانے والا، ذائقہ چکھنے والا، لطف اٹھانے والا۔

اللہ کا محبوب اپنی امت کو لیکر مسجد حرام میں اُٹھ بیس برس بعد آج اپنے خالق کی نماز ادا کرتا ہے یہ وہ باتیں ہیں کہ سُننے میں حسیتقد خوش آیند ہیں عمل میں اسی قدر معرکۃ الآرا ہیں کوئی دوسری مثال تم کسی قوم کی پیش نہ کر سکو گے سلطنت اور شے ہے اور نبوت و رسالت کچھ اور ہے یہ تجلیات ختم رسالت کی تھیں اس کا مقابلہ ملمع کاری[1] و ملمع سازی[2] کیا کریگی ؏

دہان یار کجا و زبان سوسن کو

نہ ہر گلے کہ بخندد مقرری داند[3]

دور کیوں جائیے حالت موجودہ کو لے لیجئے۔ اس وقت یورپ نے تہذیب کا وہ غلغلہ[4] بلند کیا کہ کتنی مسلمان کی اولاد آن کے اس ہنگامے میں ایسی تہ و بالا ہوئی کہ اسلامی معاشرت اسلامی لباس اسلامی صورت یہاں تک کہ اسلامی نام سے آسے چڑ ہو گئی۔ خواب میں بھی یورپ کا جلوہ ہے اور بیداری میں بھی آسی کا تصور۔ اب جو یورپ کے حصص باہم لڑ پڑے تو تہذیب و تمدن کا جامہ آن کے جسم سے الگ ہو گیا اور آنکی وحشت اور بربریت صاف صاف ہر شخص کو نظر آنے لگی۔ جرمنی جس نے تہذیب و انکشافات[5] علمیہ میں تمام یورپ سے اپنی اُستادی کا سکہ منوا لیا تھا جب میدان جنگ میں اترتا ہے تو بلجیم کے ساتھ صرف اتنی بات کہ اُس نے راستہ دینے سے انکار کیا تھا اور اپنی خود مختاری و حقوق کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا کیسا عبرتناک سلوک کیا۔ پھر جب اُستاد کی یہ حالت ہو تو شاگردوں کا کیا پوچھنا[6]۔ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ

حیات محمدی کا ایک دوسرا پہلو

اب ایک نظر اپنے پیغمبر کے اس پُر انوار حصۂ زندگی پر ڈالئے جس کا تعلق محض خالق سے تھا۔ باوجود ان گوناگون مہمات اور مختلف خدمت و اصلاح عباد کے عبادت الٰہی میں وہ کس طرح مستغرق[7] ہے۔ امت کی تعلیم و تربیت۔ کفار و مشرکین یہود و نصاریٰ کی مدافعت[8]۔ اہل و عیال کی کفالت[9]۔ غرض طرح بطرح کے اہم امور روزانہ درپیش ہیں اور ہر ایک اپنی جگہ پر باحسن وجوہ انجام پا رہے ہیں مگر کیا مجال کہ ان مصروفیتوں میں ادنیٰ کہ صلوٰۃ و صیام میں کچھ گرانی بھی ہونے پائے۔ حضرت عائشہ صدیقہ آپ کی نماز تہجد کو بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرماتی ہیں ثم فلا تسئل عن طولھن وحسنھن[10] اب نہ پوچھ کہ وہ کس قدر دراز اور کس قدر خوبصورت نمازیں ہوتی تھیں تمام رات قیام میں بسر فرماتے اور ایک حالت ذوق و شوق میں کلام اللہ پڑھتے جاتے رات ختم ہو جاتی اور عبادت کی تمنا باقی ہی رہ جاتی یہاں تک کہ قدم مبارک ورم کر گئے۔ اس واقعہ کی خبر قرآن کریم

[1] ملمع کاری۔ ملمع کا کام، وہ چیز جس پر سونے یا چاندی کا پانی چڑھایا ہوا ہو (۲) منافقت (۳) (کنایۃً) ظاہری ٹیپ ٹاپ [2] … سازی۔ سفیدی پھیرنا (۲) وارنش، رنگ کا ملمع، برتنوں پر رنگ چڑھانے کا عمل۔ [3] "یار کی زبان کہاں اور دہان سوسن کہاں، ہر وہ پھول جو کھلتا ہے بات کی قدرت نہیں رکھتا۔" [4] غلغلہ۔ دھوم، شور، آوازہ (۲) غل، غوغا (۳) دھاک، شہرہ [5] انکشافات (انکشاف کی جمع) ظاہر ہونا، کھلنا (۲) کھولنا

یوں دیتا ہے طٰهٰ ۚ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰۤى ۙ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰى [۱] (اے حبیب قرآن ہم نے اس لئے نہیں نازل کیا کہ تم مشقت میں پڑجاؤ یہ تو ڈرنیوالوں کیلئے ایک نصیحت ہے)۔

حضرت! اس پر لطف مضمون کو کہاں تک بیان کروں ؎ نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں [۲]۔ صرف اس قدر سمجھ لینا کافی ہوگا کہ عبادت ہی آنحضرت کی چین تھی اور یہی آپ کا آرام تھا۔ اس کے سوا کسی چیز میں آپ کو لذت نہیں ملتی تھی جب کبھی طبع لطیف حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکدر [۳] ہوتی تو حضرت بلال سے فرماتے کہ اَرِحْنِیْ یَا بِلَالُ [۴] (اے بلال مجھے راحت پہونچاؤ) حضرت بلال اذان دیتے۔ اس کبیر المتعال [۵] کا نام ترتیب اذان میں سنکر اس پیکر عشق الٰہی کو عجب فرحت وانبساط ہوتا [۶]

دل زندہ می شود بامید وصال یار + جاں رقص می کند بسماع کلام دوست [۷]

دل میں ایک طرب انگیز حقیقی سرور پیدا ہوتا اور سرتن [۸] مو بادۂ محبت الٰہی میں مخمور ہوجاتی۔ شوق لیدا کر محراب عبادت میں کھڑا کردیتا اور وہ خدا کا محب ومحبوب نماز میں مصروف ہوکر عالم ناسوت وملکوت [۹] طے کرتا ہوا لی مع اللہ وقت لا یسعنی فیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل [۱۰] پر پہنچکر مشاہدۂ تجلیات شاہد حقیقی میں مصروف ہوجاتا اور فارغ ہوکر اپنی امت سے فرماتا کہ قرۃ عینی فی الصلوٰۃ [۱۱] میرے آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے۔

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم

ختم کلام

اے حضرات [۱۲]۔ غور کرو یہ بے سروپا زندگی کب تک۔ ہفوات [۱۳] ولایعنی کلمات کا ورد کہاں تک۔ عمر گران بہا کا صرف [۱۴] کس حد تک آؤ ہم اپنی زندگی کا کوئی مقصد قرار دیں تاکہ ہمارے اقوال وافعال ایک محور پر گردش کریں۔ جب تک اقوال وافعال کا کوئی محور قرار نہ دینگے اس وقت تک ہماری زندگیاں صحیح نتیجے پر نہ پہونچینگے۔

زمین اپنے محور پر گردش کرتی ہے اس سے لیل ونہار وتغیرات موسم پیدا ہوکر طرح طرح کے گل کھلاتے ہیں اور کیسے عجیب وغریب فوائد ہیں اس سے حاصل ہوتے ہیں۔ پس ہمارے اقوال وافعال اگر ایک محور پر گردش کرینگے تو کیا ان سے مفید نتائج حاصل نہ ہونگے ہونگے اور ضرور ہونگے۔ پس

---

۱ طٰہٰ: ۲ تا ۳ ۲ (مصرع) "نہ آپ کے حسن کی کوئی حد ہے اور نہ سعدی کی بات کا کوئی انجام۔" ۳ مکدر (کنایۃً) غمگین، رنجیدہ

۴ یا بلالُ اَرِحْنَا بِالصَّلٰوۃ۔ مسند احمد بن حنبل، احادیث رجال من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم، رقم الحدیث ۲۲۴۷۶، ۵/۳۶۵، بیت الافکار الدولیۃ۔ اردن، ۲۰۰۳ء، ص ۱۶۹۹ ۵ کبیر المتعال۔ خدائے بزرگ وبرتر۔ ۶ "محبوب کے وصال کی امید سے دل زندہ ہوجاتا ہے۔ دوست/محبوب کی آواز سن کر روح رقص کرنے لگتی ہے۔" ۷ تن مو سیال کی جز بدؤں ۸ عالم ناسوت وملکوت۔ فانی عالم اور فرشتوں کی دنیا

اب ہمیں ایک محور تلاش کرنا ہے۔ مگر اس کی تلاش میں ہمارا زیادہ وقت رائگاں نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ہم کو جب یہ معلوم ہو جائیگا کہ ہمارے پیغمبر روحی فداہ نے کونسا محور[1] اپنی حیات کا قرار دیا تھا تو ہم نہایت سہولت سے اس میں کامیاب ہو جائینگے۔ قرآن شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مبارک کا یہ محور[1] بتلاتا ہے۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہدو اے میرے محبوب کہ میری نمازوں کا پڑھنا عبادتوں کا کرنا یہاں تک کہ جینا اور مرنا سب اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جو تمام عالم کا رب ہے[2] ؎

عاشقی دانی چہ باشد بے دل و جاں زیستن + جان و دل در باختن بر بوئے جاناں زیستن[3]

پس معلوم ہوا کہ اگر ہمارے تمام اقوال و افعال اس محور[1] کے گرد چکر لگائیں تو زبان بھی آفات سے محفوظ اور جوارح[4] ہر قسم معاصی سے امن میں رہ سکتے ہیں۔ خدا کو حاضر و ناظر جانو۔ پھر جو چاہو کہو اور جو چاہو کرو اور جہاں چاہو جاؤ۔ بیہودہ خیال ہے اور اس کا ایسا تصرف ہے کہ تمھیں لغو و بیہودہ اقوال و افعال سے اس حال میں بھی باز رکھیگا جس حالت میں کسی قانون بشری کی نگاہ یا اس کا پنجہ گرفت تم تک نہیں پہونچ سکتا ہوگا۔ زبردست سے زبردست قانون زبان و اعضا کو ارتکاب جرائم سے البتہ باز رکھتے ہیں اور ان پر حکومت کر سکتے ہیں لیکن دلوں پر حکومت کرنے والا اور معاصی کی بنیاد قلب سے زائل کرنے والا تو صرف خدا ہی کا خوف اور اسی کی یاد اور اسی کا نام ہے۔ پس اے دوستو۔ صدق و اخلاق سے للّٰہیت کو اپنی زندگی کا محور قرار دو اور بے کھٹکے نہایت کامیاب شاداں و فرحاں اس دار المحن[5] سے سفر کر جاؤ۔ اب اس سے زیادہ کیا کہوں ؎

گفتگو آئین درویشی نبود

ورنہ با تو ماجراہا داشتم[6]

آہ اے گلشن اسلام کیا ہوئی تیری وہ بہار جس نے اپنے فیض کرم سے خارزار جفا کو لالہ زار وفا بنا دیا تھا! سوکھی کلیاں لبہائے جاناں کی طرح تر و تازہ پنکھڑیاں نکال لائی تھیں، ہر شاخ نخل امثار خوشگوار سے باردار تھی، اور ہر برگ ایک ایک رگ میں لاکھوں چشمے سرسبزی کی امانت رکھتی تھی! تیری باد سموم[7] یورپ کی نسیم سحر سے کہیں بڑھ چڑھ کر خدمت صبا انجام دیتی تھی، اس کا ایک جھونکا غنچہائے سربستہ کو کھلا دیتا تھا۔ اب وہی تو ہے وہی تیرے مرغان طرب کی صدائیں ولیکن نہ کوئی کان ان کو سننا گوارا کرتا ہے نہ کوئی دماغ ان سے راحت پاتا ہے، عقل کو حیرت ہے اور ذہن کو چکر کہ آخر دیکھتے دیکھتے یہ رنگ چمن کیونکر بدلا؟! باغبانی کی خدمت جن کے قبضۂ قدرت میں دی گئی تھی وہ کیوں ٹھہر[8] سے گئے

۱؎ محور۔ وہ شے جس پر کوئی چیز گھومے یا گردش کرے۔ آل (۲) (اصطلاح علم ہیئت) وہ فرضی خط جس کے گرد زمین گردش کرتی ہے۔ ۲؎ الانعام:۱۶۲
۳؎ "جانتے ہو کہ عاشقی کیا ہے؟ بے دل و بے جاں زندہ رہنا، جان و دل ہار جانا اور محبوب کی خوشبو پر زندہ رہنا۔" ۴؎ جوارح (جارحہ کی جمع) آدمی کے ہاتھ پاؤں، زبان اور دوسرے اعضا۔ ۵؎ دار المحن (محن محنت کی جمع) امتحانوں، مصائب، دکھوں، تکلیفوں، بلاؤں کا گھر
۶؎ (حافظ شیرازی) "بحث مباحثہ درویشوں کا شیوہ نہیں، ورنہ میں بھی تم سے کوئی کچھ نہ سنتا تھا۔"

اَنکڈول و بیڈول کوئی شاخ نہیں دیکھتے چاٹتے پر تالے بیٹھے ہیں۔ قرآنی گرامیوں کی نہریں اسی طرح جاری ہیں
بارشیں اب طلب العطش العطش کی رٹ لگائیں۔ احادیث کریمہ کے حوض اسی طرح لبریز لیکن دراق آسنا
والے ایک قطرہ بھی نہ پائیں۔ فقہ کے مسائل اسی طرح حاجت روا لیکن قوانین مجریہ کے ہاتھوں اعضا شکنی
کے شکار۔ تصوف کے نکات طالب راہ کے واسطے اسی طرح مشعل بکف مگر علوم جدیدہ کی بھول بھلیاں کی
بدولت اندھیر کا ذخیرہ۔ علم کلام حل مشکلات فلسفہ میں مخزن حکمت مگر عقول حل و عقد سے دفتر پارینہ۔ بیسا کھیں
تیرے رفیق نہیں، آمرا تیرے غمگسار نہیں۔ نہ بوریہ میں تیرا جلوہ نہ مسند میں تو رونق بخش۔ افسوس! اے

اے صبا مایۂ سودا نہ تو داری و نہ من
بوئے آں زلفِ چلیپا نہ تو داری و نہ من ؎[۲]

اللھم افتح لنا بالخیر واختم لنا بالخیر واجعل عواقب امورنا بالخیر بیدک الخیر
انک علیٰ کل شیٔ قدیر وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ من ھو الاول والاٰخر والظاھر والباطن
وھو بکل شیٔ علیم۔

حررہٗ بقلمہٖ

فقیر محمد سلیمان اشرف عفی عنہ

قصبہ بہار۔ محلہ میر داد

---

[۱] سڈول۔ ڈول کا مذکر یا خوش نما، خوش وضع، خوب صورت (۲) نہایت سڈول ؎ بے ڈول۔ بدنما، بدقطع، بدوضع، بدزیب۔
[۲] افسوس۔ کلمۂ اظہار یاس ؎ "اے صبا سرمایۂ جنون نہ تو رکھتی ہے نہ میں۔ ان گھنگھریالی زلفوں کی خوشبو نہ تیرے پاس ہے نہ میرے پاس۔"

CALL No. ٨٩١٤٣٥ / ١٤٣٩٥س ACC NO. ١٣٧٤٣

AUTHOR سلیمان اشرف

TITLE الخطاب

...KED AT THE TIME

Date	No.	Date	No.
12 910.03			

MAULANA AZAD LIBRARY
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

RULES:

1. The book must be returned on the date stamped above.
2. A fine of Re. 1-00 per volume per day shall be charged for text-books and [illegible] Paise per volume per day [illegible] general books kept over-due.

کتب خانہ مولانا آزاد علی گڑھ کے ذخیرہ میں نسخہ **الخطاب** کے اجراء کارڈ کا عکس

بہ زبانِ ناشر

۱۸۵۷ء کے کٹھن اور پُر آشوب دور کے معاً بعد اسلامیانِ ہند کو اپنے ملی وجود کو درپیش سخت اور نازک چیلنج سے نبرد آزما ہونے اور مسلم قوم کی نشاۃ ثانیہ کے لیے سر سید احمد خان نے اس عظیم خدمت کا بیڑا اُٹھایا اور 'انقلاب بذریعہ تعلیم' کا نعرہ بلند کیا۔ سر سید کی تعلیمی تحریک کا اولین عملی قدم محمڈن ایجوکیشنل کانگرس کا قیام تھا، جس کا نام بعد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہو گیا تاکہ لوگوں کو آل انڈیا نیشنل کانگرس سے اس تنظیم کی الگ اور منفرد حیثیت کا احساس ہو۔

کانفرنس کے اجلاسوں کی صدارت سربرآوردہ ماہرانِ تعلیم نے فرمائی۔ سالانہ جلسوں میں کی جانے والی تقاریر اور ہر خطبہ اپنے قومی نقطۂ نظر کے علاوہ جہاں ایک طور سے صاحبِ خطبہ کے نہاں خانۂ دل کا مجلا آئینہ اور رجحانات کا ورق کشادہ ہوتا ہیں ان اجلاسوں میں قوم کی ترقی کی تدبیریں سوچی جاتیں، اور قابلِ عمل تجاویز مرتب کی جاتیں، متفرق اور منتشر قوم کو منظم اور مجتمع کرنے کے لیے غور و خوض ہوتا۔ باہمی صلاح و مشورہ سے قوم کی ترقی کا سیدھا راستہ نکالنے کی سعی کی جاتی۔

اس صدارتی خطبہ میں قوم کو یاد دلایا گیا تھا کہ جب تک عورتیں تعلیم یافتہ نہ ہوں گی بچوں کی تعلیم و تربیت معقول طریقہ سے نہ ہوگی، کیوں کہ تعلیم کی ابتدا آغوشِ مادر سے ہوتی ہے۔ چند سال کی پیہم تبلیغ و ترغیب کے بعد مسلمان تعلیمِ نسواں کی ضرورت کا دم بھرنے لگے۔ یہ شاید حالات کا جبر اور بعض اہلِ وطن کی تنگ نظری کی وجہ سے ملازمت کے دروازے مسلمانوں کے لیے بند ہونے کے خطرہ کے باعث صنعتی و تجارتی تعلیم کے حاصل کرنے کی ضرورت بھی مانی جا چکی تھی۔ ورنہ یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر مسلمان صنعت و حرفت پر متوجہ نہ ہوئے تو وہ کسبِ معاش کے زرخیز

وسائل سے محروم رہ جائیں گے۔

تعلیمی کانفرنس کے زیر اہتمام پڑھے جانے والے خطباتِ صدارت جیسا کہ گزشتہ صفحات میں آ چکا کوئی چالیس سالوں (۱۸۸۶ء تا ۱۹۲۵ء) پر محیط ہیں۔ آج سے نوے (۹۰) سال قبل شائع ہونے والے خطبات کی اہمیت وافادیت اور قدر و قیمت کیا ہے؟ اور مسلمانوں کی تعلیم پر بتدریج ان کے کیا اثرات مرتب ہوئے!!...... یہ آپ 'خطبات عالیہ' کے مقدمہ نگار فاضلِ ندوہ مولانا محمد اکرام اللہ خاں صاحب کی زبان بلاغت نظام سے سنیئے۔

"آپ ان خطبات کا غور سے مطالعہ کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تعلیم کے متعلق کتنے جدید مسائل پیدا ہوگئے اور ملک کی سیاسی و اقتصادی حالت نے مسلمانوں کی تعلیم پر کیسا زبردست اثر ڈالا ہے یہ چیزیں آپ کو کسی دوسری کتاب سے معلوم نہیں ہو سکتیں لہٰذا اس پہلو سے بھی خطبات کا مطالعہ مسلمانوں کے لیے مفید و سود مند ہے۔"

کانفرنس کے سالانہ اجلاس متحدہ ہندوستان کے مختلف صوبجات میں علی گڑھ، لکھنؤ، لاہور، الٰہ آباد، دہلی، شاہ جہاں پور، میرٹھ، کلکتہ، رام پور، مدراس، آگرہ، بمبئی، ڈھاکہ، راولپنڈی اور دیگر مقامات پر جن صاحبانِ علم وحکمت کی صدارت میں انعقاد پذیر ہوئے، کے بارہ مولوی انوار احمد زبیری (مارہروی) رقم فرماتے ہیں۔

"جن باوقار لوگوں نے کانفرنس کے جلسوں کی صدارت کے فرائض انجام دیئے ہیں وہ اپنی مختلف النوع قابلیتوں اور اوصاف کے لحاظ سے اپنے اپنے دورِ زندگی میں اس پایہ کے بزرگ تھے اور ہیں جن کا مرتبہ نہ صرف علمی حیثیت سے بلند نظر آتا ہے بلکہ ان کی اصابتِ رائے اور ان کی قومی ہمدردی کی وجہ سے بھی خواہانِ قوم کے سربرآوردہ طبقہ نے اُن کو منصب صدارت پر منتخب کر کے عملاً اُن کے فضل و کمال کا اعتراف کیا۔" (دیباچہ: خطباتِ عالیہ، حصہ اول)

ان خطبات میں خطبہ صدارت مولوی سر رحیم بخش (۱۹۱۴ء) ایک نمایاں اور قابل ذکر حیثیت کا حامل ہے۔ جس کی اہمیت اور افادیت اس کے مندرجات پڑھنے کے بعد ہی سمجھی جا سکتی ہے۔ ہم کوئی تبصرہ کیے بغیر یہ کام قارئین کرام پر چھوڑتے ہیں۔

ناشر

فہرست کتب قدیمہ

خطباتِ عالیہ

یعنی

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے

چہل سالہ خطباتِ صدارت کا مجموعہ

حصۂ دوم

(از اجلاس بست ویکم تا اجلاس سی ام)

جس میں ہر معزز صدر کے قابل مطالعہ و سبق آموز حالاتِ زندگی مع فوٹو کے چھاپے گئے ہیں

مرتبہ

مولوی انوار احمد صاحب زبیری (مارہروی)

حسب الارشاد جناب نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حاجی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی

آنریری سکرٹری آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

زیر ارم مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ میں طبع ہوئے ۱۳۴۶ھ ۱۹۲۸ء

بار اول (صدر دفتر کانفرنس نے شائع کئے) ۱۰۰۰ جلد

عکس سرورق: خطباتِ عالیہ حصہ دوم مرتبہ مولوی انوار احمد زبیری، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۲۸ء

اجلاس بست و ہشتم

(منعقدہ راولپنڈی سنہ ۱۹۱۴ء)

صدر مولوی حاجی سر رحیم بخش صاحب خان بہادر کے سی آئی ای پریسیڈنٹ کونسل آف ریجنسی ریاست بہاولپور

حالات صدر

مولوی سر رحیم بخش ان منتخب افراد قوم میں سے ہیں جو اپنے زور بازو سے اُٹھ کر اعلیٰ مدارج کے ان بلند درجوں پر پہنچے جن کی آرزو بڑے سے بڑے نام آور شخص کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ نسل اور قومیت کے لحاظ سے "راجپوت" مسلمان ہیں جن کا ابتدائی نشو و نما ان کے اپنے وطن موضع (مشکہ میران جی) ضلع کرنال میں ہوا اپنے وطن کے ورنیکولر مدرسہ میں وہ پڑھنے کے لئے بیٹھے اور مڈل پاس کر کے پانچ روپیہ کا وظیفہ قابلیت حاصل کیا جس کے بعد نارمل اسکول دہلی میں داخل ہوئے اور درجہ بدرجہ اپنے تعلیمی معیار کو بلند کر کے نوکری کرنے پر مجبور ہوئے ۱۸۷۹ء میں ان کو مدرسی کی ملازمت ملی جن کی ابتدائی تنخواہ پندرہ ۱۵ اور پچیس ۲۵ روپیہ ماہوار تک تھی۔ ۱۸۸۶ء میں ترقی کر کے چیفس کالج لاہور کی صدر مدرسی پر پہنچے۔

ان کی زمانہ مدرسی میں سابق ہز ہائینس نواب صاحب مرحوم بہاول پور چیفس کالج میں زیر تعلیم تھے۔ نواب صاحب کے لئے ایک لائق مصاحب کی تلاش تھی مولوی صاحب کے اوصاف نے ان کے لئے اس منصب کی سفارش کی جو مصاحبت کے بعد ۱۸۹۲ء میں ہز ہائینس کے ایڈی کانگ مقرر ہو گئے۔ اسسٹنٹ

خطبات عالیہ حصہ دوم ، طبع علی گڑھ کا صفحہ ۲۰۰

کی ملازمت سے وابستہ ہوگئے اور پانچ برس تک پوری وفاداری اور قابلیت کے ساتھ ۱۹۰۰ء میں اس ملازمت سے سبکدوشی حاصل کی مدت ملازمت کے لحاظ سے وہ مستحق پنشن نہ تھے لیکن ان کی عمدہ خدمات نے خاص پنشن کا مستحق بنا دیا تھا کچھ عرصہ تک وہ اپنے وطن میں خانہ نشیں رہے اس کے بعد ضلع مظفر نگر اور کرنال کی ریاست منڈال کے منیجر مقرر ہوگئے اور ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۳ء تک فرائض منیجری انجام دے رہے تھے جو اس دوران میں ہز ہائینس نواب صاحب بہاول پور نے دوبارہ یاد کر کے پرائیوٹ سکرٹری کی خدمت پر طلب کر لیا، اور ایک سال کے اندر ریاست کے چیف جج مقرر ہوئے، اور پھر ۱۹۰۵ء میں فارن سکرٹری کے عہدہ پر ممتاز کئے گئے۔ اُنھوں نے اپنی محنت، دیانت، وفاداری اور اعلٰے درجہ کی قابلیت انتظامی کے لحاظ سے اور اپنے مضبوط کیریکٹر کی وجہ سے اپنے اعتبار اور وقار میں حیرت انگیز ترقی کی یہاں تک کہ جب نواب صاحب کا انتقال ہوا اور ریاست میں انتظامی کونسل کا تقرر گورنمنٹ پنجاب کے زیر نگرانی عمل میں آیا، تو ۱۹۰۷ء میں کونسل آف ریجنسی کی صدارت عظمٰی کا عہدہ آپ کو پیش کیا گیا۔ جنھوں نے برسوں اس عہدے کے اہم فرائض کو اس وقت تک جب تک کہ رئیس حال با اختیار نہ بنائے گئے پوری خوش اسلوبی پوری وفاداری اور اعتماد باہمی کے ساتھ انجام دینے کی کامیاب اور نیک نام کوشش کی۔ ایک طرف برٹش گورنمنٹ کے اعلیٰ حکام نے ان کی خوش انتظامی تدبر کو تسلیم کیا تو دوسری طرف وہ رئیس اور ریاست کے پورے وفادار اور خیر اندیش ثابت ہوئے۔ اور وہ ہمیشہ اپنی بڑی ذمہ داریوں کے مقابلہ میں رئیس، رعایا اور حکام کی نظروں میں اعتبار اور عزت کی نظر سے دیکھے گئے انھیں خدمات جلیلہ کے اعتراف میں ۱۹۰۹ء میں ان کو سی، آئی، ای کے خطاب سے گورنمنٹ انگریزی نے سرفراز کیا۔

۱۹۱۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا کے سنٹرل پبلسٹی بورڈ میں بطور ایک مسلمان ممبر کے آپ کا تقرر ہوا اور جنگ عظیم کی خدمات کے صلہ میں جو ریاست نے انجام دی تھیں ۱۹۱۹ء میں کے سی آئی ای بنائے گئے اس کے علاوہ متعدد اسناد و تمغہ جات و نشانات اعزازی بہت سے مواقع پر برٹش گورنمنٹ سے حاصل کئے اور اب زمانہ دراز کے بعد خدمات ریاست سے جدا ہو کر بحصول پنشن و انعام خاص مختلف ملکی و قومی خدمات میں حصہ لے رہے ہیں۔

انھوں نے ہمیشہ سادہ اور عملی زندگی کو اپنا نصب العین قرار دینے کی کوشش کی وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی حیثیت سے پابند مذہب اور با اخلاق مسلمان ہیں۔ جب وہ ریاست میں با اختیار اور ذمہ دار حاکم تھے اُس وقت سے مختلف ملکی انسٹی ٹیوشن اور قومی درس گاہیں اُن کی روشن خیالی فراخ قلبی اور ہمدردی کی رہین منت ہیں اور رہیں گی وہ آج اُس چیفس کالج لاہور کی مجلس انتظامی اور کونسل کے رکن ہیں جس میں کبھی ان کی حیثیت ایک معمولی مدرس کے درجہ پر تھی وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی کورٹ و کونسل کے ممبر اور انجمن حمایت اسلام لاہور کے لائف ممبر ہونے کے علاوہ انجمن ترقی تعلیم مسلمانان امرت سر کے صدر ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی کی زندگی میں مرحوم کی تحریک و کوشش سے پچاس ہزار کا سب سے بڑا عطیہ مجلس ندوۃ العلماء کی جماعت کو دار العلوم ندوہ کی تعمیر میں بہاول پور کی محل سرا شاہی کی جس خاتون محترم نے عطا کیا تھا وہ آپ کی اس عملی دلچسپی کا نتیجہ تھا جو آپ کو اس مذہبی علمی مجلس اور اس کے دار العلوم کے ساتھ ابتدائے کار سے آج تک مسلسل طور پر وابستہ کئے ہوئے ہے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس و دیگر مجالس ہائے قومی کی صدر نشینی کی عزت بھی رہان کو مل چکی ہے۔

چنانچہ ۱۹۱۴ء و ۱۹۱۹ء کے اجلاس ہائے کانفرنس منعقدہ راول پنڈی و خیر پور اسٹیٹ میں وہ دو مرتبہ صدر بنائے گئے اسی طرح ۱۹۱۸ء میں بمقام لکھنؤ اجلاس ندوۃ العلماء کی صدارت فرمائی ۱۹۲۳ء و ۱۹۲۴ء میں انجمن مسلم راجپوتانہ پنجاب کی انجمن کے صدر تھے۔ آل انڈیا تنظیم کمیٹی کے عارضی طور سے اور آل انڈیا تبلیغ الاسلام کے مستقل صدر ہیں۔

سال گزشتہ میں اضلاع اودھ اور ممالک متحدہ آگرہ کے اکثر مشرقی اضلاع کا تنظیم کمیٹی کے سلسلہ میں مسلسل طور پر کئے مہینے آپ نے دورہ کر کے قوم کو دعوتِ علم و عمل دینے کی کوشش فرمائی ہم نے بہت سے قومی کام کرنے والوں کے جوش عمل کو دیکھا ہے قومی خدمت کے لئے پیرانہ سالی میں اس عظیم جفاکشی اور شہر شہر مہینوں دورہ کرنے کی جو مثال انھوں نے پیش کی ہے یہ مثال ان جیسی حیثیت کے لوگوں میں نظر نہیں آتی غرض بہترین اخلاق اور خصائصِ عملی کے لحاظ سے سر موصوف کا کارنامۂ حیات قومی ہمدردی "سیلف ہیلپ" اور خودداری کے لحاظ سے قوم میں ایسا زندہ نمونہ ہے جو ہر لحاظ سے قابل تقلید اور لائق عمل ہے۔

خطبۂ صدارت

خواتین و حضرات! ایسے لمحے بھی انسان کی زندگی میں آتے ہیں جب کہ اس کو کام یا فرض کی انجام دہی کے متعلق جو اس پر عائد ہوتا ہے اپنی دماغی ناقابلیت کا سب سے زیادہ احساس ہوتا ہے۔ اس وقت میرے اوپر بھی ایسا یا تقریباً ایسا ہی احساس غالب ہے۔ یہ پنڈال جو سر سید احمد جیسے نیک نہاد و عاقل و فرزانہ، نواب محسن الملک جیسے روشن دماغ فصیح و بلیغ، رائٹ آنریبل سید امیر علی جیسے برگزیدہ فرزند ہند و ممتاز مقنن، مولوی نذیر احمد صاحب جیسے جید عالم، نواب عماد الملک جیسے فاضل و اہل الرائے اور ہمارے پنجاب کے فخر قوم آنریبل مسٹر شاہ دین جیسے ممتاز جج کی فصاحت و بلاغت سے گونجتا رہا ہے بلا اظہار تصنع مشکل سے اس شخص کے لئے جگہ ہو سکتی ہے جس کی مصروفیاتِ زندگی ایک دوسرے دائرہ اور ایک مختلف احاطہ میں رہی ہوں جب اُن معیاروں کا خیال کیا جاوے جن کی بناء پر آپ کے بہت سے صدر نشین منتخب کئے جا چکے ہیں، جن میں سے صرف چند کا میں نے نام لیا ہے تو میں خیال کرتا ہوں کہ آپ کا یہ انتخاب کوئی خوش گوار انتخاب نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں بھی کالج کا ایک ٹرسٹی ہوں اور میرا تعلق کبھی کسی زمانہ میں کسی نہ کسی طرح پر تعلیمی تحریکات سے رہا ہے لیکن نفس الامر میں میرا تعلق پبلک لائف سے نسبتاً مختصر طرز کا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ حضرات نے یہ خیال کیا ہو کہ ایک ایسے شخص کے خیالات و آرا کو معلوم کریں جو آپ کے حلقہ سے باہر کا ہو، اور میرا گمان ہے کہ آپ کا یہ انتخاب ممکن ہے کہ کسی جدید اور غیر معمولی توجہ اور لحاظ کی بنا پر ہوا ہو، اور آپ کو یہ خیال پیدا ہوا ہو کہ ایک تماشائی یا اکھاڑے سے باہر کا شخص بسا اوقات اُس شخص سے بہتر طور پر کھیل کا اندازہ لگا سکتا ہے جو خود کھیل میں شامل ہو۔

صاحبان! اگر آپ کا ایسا ہی خیال ہو تو میں اس عزت افزائی کے لئے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جو آپ نے اپنی انجمن کا صدر نشین منتخب کر کے مجھے بخشی ہے گو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس ذمہ داری کے بوجھ سے میں دبا جاتا ہوں جو قدرتاً مجھ پر عائد ہوتی ہے۔

بالیقین میں اس کو ایک اعلیٰ اعزاز تصور کرتا ہوں کہ آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی صدارت قبول کرنے کے لئے مجھ سے ارشاد کیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی اس کے میں یقین دلاتا ہوں کہ میں کبھی اس جگہ، کم از کم اس حیثیت میں، حاضر نہ ہوتا اگر مجھے گزشتہ تجربہ کی بنا پر یہ معلوم نہ ہوتا کہ مسلمان سامعین ایک ایسے شخص کی تقریر کو کس تلطف آمیز طریقہ سے سنتے ہیں جس کی دماغی قابلیتیں خواہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہوں لیکن یقین جانئے کہ اس کے دل میں ملک اور قوم کے مشترکہ مقصد کو محسوس کرنے میں اُن حضرات میں سے کسی سے کم تڑپ نہیں ہے جن کے اسمائے گرامی اس طولانی اور ممتاز فہرست میں شامل ہیں جنھوں نے گزشتہ مواقع پر آپکے اجلاسوں کی کارروائی کی رہ نمائی کی ہے۔

اکابرین قوم کا اثر افسوس ہے کہ اُن اکابر میں سے جو مسلمانان ہند کی شاہ راہ تیار کرنے والے اور "صد ہا قرون کے معلمین" تھے ہم سے جدا ہو گئے۔ لیکن اُن کا اقتدار اب تک قائم ہے اور عرصہ دراز تک قائم رہے گا، تاکہ منازل الحیات میں وہ ہماری رہ نمائی کرے انہیں روشنی بخشے اور ہماری ہمت افزائی کرے۔ واضح بیلیں جو وہ لگا گئے ہیں اور یادگاریں جو وہ چھوڑ گئے ہیں بکثرت ہمارے سامنے موجود ہیں اور اُن سے اُن کی ذکاوت اور ذہانت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

جنگ اے حضرات! ہم آج ایسے زمانہ میں مجتمع ہوئے ہیں جب کہ ہمارے سروں پر ایک مصیبت کبریٰ کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ جنگ جو یورپ میں ہو رہی ہے وہ بلاشبہ ایسی خوفناک ہے کہ جس کی نظیر تاریخ کے صفحات میں نہیں ملتی۔ گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کو ہم لفظ "تہذیب و تمدن" سے موسوم کرنے کا اشتیاق رکھتے ہیں وہ ایسی کمزور و ناطاقت شے ہے کہ وہ اُس جوع الارض کے طوفان اور حملوں کو نہیں روک سکتی جو از منۂ ماضیہ میں کسی نہ کسی شکل میں تباہ کن جنگوں اور حملوں کا باعث ہوا کرتی تھی۔ نہ تو اس کا یہ موقع ہے اور نہ وقت کہ اُن اسباب پر پوری پوری بحث کی جاوے جو اس جنگ کا باعث ہوئے ہیں۔ یہ اسباب نہایت کثیر اور مختلف النوع ہیں، اور میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ ایک تعلیمی مجلس ہرگز ایسی جگہ نہیں ہے جہاں ان کے متعلق کوئی مطول و مبسوط بحث کی جا سکے۔ لیکن بحیثیت ایک ایسے شخص کے جس نے قدیم طرز کی روایات میں پرورش پائی ہو میں اپنی اُس رائے کے اظہار کی جرأت کرنا چاہوں گا جس کو میں ایسے گہرے یقین اور عمیق اعتقاد کے ساتھ محسوس کرتا ہوں

جو حدیمان سے باہر ہے کہ زمانۂ حال کی تہذیب کی سب سے بڑی خرابیاں اس کی "مادیت" کے عنصر کا غلبہ اور تمام دیگر خیالات پر مطلب پرستی کے قابل اعتراض عقیدے کو ترجیح دینا ہے۔ ہر ایک تعلیمی تحریک کی پائیداری اس کی مذہبی رنگت ہے۔ ہمارے سادہ شرقی خیال کے مطابق کوئی تعلیم مکمل نہیں ہوتی، تا وقتیکہ اس کی بنیاد انسان کے عقائد مذہبی پر نہ رکھی گئی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں لوگ مادہ پرستی کی طرف اندھا دھند او بے بس ہو کر دوڑ پڑے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس بات سے مدبران شرق و مغرب ڈرتے اور خوف کھاتے تھے آخر کار وہی پیش آئی اور آتش جنگ نے خوفناک طور پر افروختہ ہو کر خدائی زمین کی لہلہاتی بہار کو تہس نہس کر دیا۔ گویا معلوم ہوتا ہے کہ ہم مسیح کے اُس روایتی ہزار سالہ زمانہ سے جس کو انگریزی شاعر نے ذیل کے دو مصرعوں میں ظاہر کیا ہے اسی قدر بعید ہیں جتنے کہ پہلے کبھی تھے ؎

"جبکہ مجلس بنی نوع انسان اور تمام عالم کے اتحادی دربار میں جنگ و جدل کے علم لپیٹ دیئے جائیں گے"

لیکن اس امر کے تسلیم کرنے میں کلام نہیں ہو سکتا کہ اس عظیم الشان تباہی و بربادی کا حقیقی باعث جرمنی کا اصول "جنگ پرستی" ہے اور لاکھوں بنی نوع انسان کی زندگیوں کی بے رحمانہ تباہی و قتل و غارت گری کی ذمہ داری خدا اور بندوں کے سامنے صرف جرمنی ہی پر ہے۔ انگلستان کو اگر اس خوفناک غارت گری میں شرکت کرنا پڑی ہے تو اپنے تحفظ حقوق کے لئے اور اس لئے کہ اپنے روایات قدیمہ کی بنا پر اس کو کمزوروں کی حمایت میں جنگ کرنا اور بنی نوع انسان کے مقصد انصاف کی پشت پناہی کرنا ہے۔

انگلستان کا مقصد مبنی بر انصاف تھا

بدقسمتی سے اس مصیبت (جنگ) نے ایک مختلف شکل اختیار کی ہے کہ ترکی نے ناعاقبت اندیشانہ طور سے اپنی قسمت جرمنی و آسٹریا کے ساتھ وابستہ کر دی ہے جو انگلستان اور اُس کے حلیفوں کے ساتھ برسرپیکار ہیں۔

صاحبو! اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ یہ معاملہ نہایت ہی پیچیدہ ہو گیا ہے اور مسلمانان ہند کے لئے یہ موقع نہایت آزمایش کا ہے۔ لارڈ ہارڈنگ بالقابہ جیسے ممتاز مدبر کی فہم و ذکا قابل ستایش ہے جن کے دست مبارک میں اس وقت ہندوستان کی زمام حکومت ہے اور جنھوں نے ہمیں یہ یقین دلایا ہے کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ وقوع میں آئے انگلستان اور اس کے اتحادی

اسلام کے مقاماتِ مقدسہ کے احترام پر نگاہ رکھیں گے۔ مجھے یقین واثق ہے کہ اس یقین دلانی نے مسلمانوں کو مطمئن کرنے میں بڑا کام کیا ہے اور مسلمانوں کو اس روش پر قایم رکھنے کے قابل بنا دیا ہے جو موجودہ حالت میں صرف ایک ہی صحیح روش ہے۔ میرا مدعا سلطنت برطانیہ کی مستحکم وفاداری اور جاں نثاری کی روش سے ہی۔

سلطنت برطانیہ کے ساتھ ہماری وفاداری کی بنیاد

صاحبان! مجھے یقین ہے کہ کسی متنفس کو بھی ایک لمحہ کے لئے اس میں کلام نہ ہوگا کہ ہم حضور ملک معظم قیصر ہند کی زیر حکومت بکمال امن وامان رہتے اور محفوظ زندگی بسر کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمیں اپنے مذہبی رسوم کی ادائیگی میں، جو ہر انسان کا پیدائشی حق ہے، کوئی رکاوٹ یا مزاحمت نہیں ہے۔ ایسی حالت میں ہمارا یہ سب سے مقدم فرض ہے کہ ہم تاج برطانیہ کے ساتھ ایسی روش اختیار کریں جو ہماری غیر متزلزل اور لاجنبش وفاشعاری پر مبنی ہو۔

اے حضرات! مجھے یقین ہے کہ ہم سب کو اس بات پر فخر ہی کہ اپنی سلطنت کی حفاظت میں مقصد نیک میں ہماری ہندوستانی افواج اپنا مناسب حصہ لے رہی ہیں اور یورپ کے میدان جنگ میں اپنی شجاعت بُردباری اور جاں نثاری سے یہ ثابت کر رہی ہیں کہ ہمارا اور انگلستان کا مقصد واحد ہی۔ تار برقیوں کے مختصر خلاصوں پر لحاظ کرتے ہوئے میرے خیال میں اس بات کے اظہار کے لئے کسی پیشین گوئی کی ضرورت نہیں ہے کہ خاتمہ جنگ یعنی امن وامان کا حصول کچھ بعید نہیں ہے۔ جرمنی کے جنگی دم خم کی کمر کم از کم اُس وقت سے ٹوٹ گئی ہے جب کہ اُس کو پیرس ہی کی طرف سے پیچھے ہٹ جانا پڑا، اور گو ابھی وہ وقت دور ہے کہ ہم کو ان مشکلات سے نجات ملے مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اتحادیوں کی متفقہ افواج نے اگر اسی طرح چند اور شکستیں دیں تو یورپ میں امن وامان پھر قایم ہو جاوے گا۔ موجودہ حالت میں ہمارا فرض ہے کہ ہم تاج برطانیہ سکے وفادار رہیں اور اس مقصد نیک کے حصول میں جو انگلستان کا ہے تمام امکانی خدمات سے دریغ نہ کریں۔

مجالس تعلیمی کی قدر وقیمت

صاحبان! میں ہمیشہ سنتا رہتا ہوں کہ عجلت پسند نکتہ چیں یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ آخر کانفرنسوں کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اور ان کانفرنسوں نے مسلمانوں کی یا مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق کیا خدمت انجام دی ہے؟ صاحبان! تعلیم ایک پودا ہے جو آہستہ آہستہ بڑھتا ہے کسی مشین یا کل کی تیز رفتاری کی طرح سے اس کے نتائج کی توقع نہیں کی جا سکتی اور نہ بارود کی سی تیزی پر اس کے

نتائج کا قیاس ہو سکتا ہے کہ ادھر آگ دکھائی اور اُدھر بار ود نے دھواں دے دیا۔ اس کے لئے
اول ضرورت ہے پھاوڑے اور کدال سے بہت کچھ کام لینے کی کالجوں اسکولوں اور وظائف
کے بہت کچھ کھاد ڈالنے اور تخم ریزی کرنے کی اور زمانہ دراز کے گڑے ہوئے تعصبات کی
ناکارہ گھاس کے نرانے کی تب جاکر کہیں ہم کو اپنی محنت و جانفشانی کے پھلوں کے دیکھنے
کی توقع کرنا چاہئے۔ جو حضرات اُن تعلیمی رپورٹوں کے مطالعہ کی تکلیف گوارا کریں گے جو
مختلف مقامی گورنمنٹوں نے شائع کی ہیں میں اُمید کرتا ہوں کہ وہ اس امر کو معلوم کرلیں گے
کہ تعلیم نے بڑی حد تک ترقی کی ہے۔ لیکن اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جاوے حالانکہ اعداد و
شمار کے موجود ہوتے ہوئے یہ نہیں تسلیم کیا جا سکتا کہ تعلیم میں کوئی قابل لحاظ اور قابل پسند ترقی
نہیں ہوئی تب بھی مجھکو یہ تسلیم کرنے میں کچھ تامل نہیں ہے کہ ایجوکیشنل کانفرنس نے جس کے لئے اس کے
بانی کی فہم وذکا قابل ستائش ہے مگر یہ ہی کم از کم اُن تعصبات کے جڑھ سے اُکھیڑنے میں کامیابی
حاصل کی ہے جو اُس دماغی تنگ دو کے حق میں مخالف لجے ہیں جس کی دور اندیش پیشگوا اور
تخم تشک نے بنیاد ڈالی تھی۔ اس لئے میں پھر کہتا ہوں کہ اگر کانفرنس نے اس کے سوا کچھ اور
کام نہ بھی کیا ہو تب بھی اُس نے مسلمانان ہند کے ممنون اور محبت بھرے دلوں میں اپنے بانی کی
اور اُن لوگوں کی یاد کو جاگزیں کر دیا ہے جنھوں نے بعد میں اس کی ترقی کے لئے سعی کی۔

مسلمانوں کا اخلاقی معیار

صاحبان! میں اب ایک مناسب حال مضمون کے متعلق کچھ عرض کرتا
چاہتا ہوں جو بادی النظر میں اگر مایوس کن معلوم ہو تو آپ مجھے معاف کریں گے۔ اخلاق اور
تعلیم کے درمیان میرے خیال میں کوئی نمایاں تفریق کبھی نہیں کی گئی ایک شے دوسری پر موثر ہے
اور پھر یہ دونوں خاص انحصار باہمی کی وجہ سے ایسے اجزا پیدا کرتے ہیں جن سے قومی وقار اور
قومی خصوصیات بنتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک طرف نصف صدی کے جمود، تساہل اور تذبذب نے
اور دوسری طرف تعصبات نے مسلمانانِ ہند کی جماعت کو پراگندہ، منتشر کرنے میں مدد دی ہو
لیکن یہ صرف وہ امور ہیں جن سے اس حالت کی تشریح ہو سکتی ہے کہ کس طرح اُس قوم کی اولاد
کو جو کسی زمانہ میں شاہی دہلی کی پر شوکت درباروں پر بر سر حکومت تھی آج ہندوستان کی صف
پائیں میں جگہ ملی یا اب اس وقت اس کا یہ درجہ ہے۔ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہو کہ مسلمانان
ہند کا اخلاقی معیار بالعموم انحطاط کی طرف رہا ہے میں سمجھتا ہوں کہ کسی قوم کی خصوصیات علی العموم
اس کے علم ادب میں منعکس ہوتی ہیں یعنی اُس علم ادب میں جو غیر کا نہ ہو بلکہ خود اسی قوم کا ہو۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ شاعری میں نمک مرچ بھی لگایا جاتا ہے لیکن شعرا کی قابلیت کا کافی لحاظ رکھتے ہوئے بھی اس امر واقعہ کی طرف سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ اگر نظم تہذیب اخلاق کے بجائے صرف تفریح کا سامان ہی مہیا کر سکتی ہو تو ایک قوم کے ادبیات کی اعلیٰ ترین غرض مفقود ہو جاتی ہے اور وہی نظم جو روزانہ زندگی کے بے شمار حقایق پر مشتمل ہے اور جسے قوم کے اقتصادی و عملی حصۂ حیات پر عظیم الشان اثر حاصل ہے، بے سود ثابت ہوتی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نظم کی توہین نہیں کرنا چاہتا لیکن نظم سے میری مراد وہ مقدس نظم ہے جو براہ راست ہمارے قلوب پر اثر ڈالتی ہے اور ہمیں عوام کالانعام کے دائرہ سے نکال کر روحانی بلندی کی طرف لیجاتی ہے۔ بیماری یا اندوہ کی حالت میں اگر ہمیں ایک شعر یا ایک معنی خیز فقرہ سُنا دیا جاوے تو ہم ایک تازگی اور بشاشت محسوس کرتے ہیں لیکن اخلاقی یا روحانی ترقی کا اندازہ کرنے کے لئے ایسے مادّی درجات مقرر نہیں ہیں جیسے ایک ظاہری حرکت کے اندازہ کے لئے ہو سکتے ہیں اور نہ یہ ترقی سطحی تازگی اور خوشی کی بنا پر متمیز ہو سکتی ہے۔ بلکہ اس روحانی ترقی کا امتیاز صرف تبدیل ہیئت سے ہو سکتا ہے جس کی واضح مثال کے لئے میں آپ کو ایک انڈے کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ وہ رفتہ رفتہ ایک کیڑا بن جاتا ہے اور کچھ مدت کے بعد پر و بال نکال کر اُڑنے لگتا ہے۔ جو نظم اس قسم کا روحانی اثر نہ پیدا کر سکے وہ میرے نزدیک محض وقت اور قابلیت کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ نظم کو انسانی طبیعت میں بڑا دخل حاصل ہے۔ وہ قلوب کو جس سانچے میں چاہے ڈھال سکتی ہے، خیالات میں بلندی پیدا کر سکتی ہے اور انسان کو مادّی خود غرضی سے نجات دلا سکتی ہے اور جب اُس کا نصب العین درست ہو تو یہ اعلیٰ ترین طاقت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن بخلاف اس سے مقصود صرف یہ ہو کہ چند کوتاہ بین و پست خیال لوگ تھوڑے عرصہ کے لئے اس کی تعریف و توصیف کے نعرے لگائیں تو یہ یقیناً ایک مجسم بدی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ بعض اوقات مضمون واحد پر کچھ شعرا کے خیالات جماعتوں کے اخلاقی تنزل کا اظہار ہوتا ہے۔ میں نے مسلمانانِ ہند کی کمزوریوں پر ہمیشہ غور کیا ہے اور میرے نزدیک اُن کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اُن میں "عزتِ نفس" کا مادّہ نہیں رہا۔ "قولِ مرداں جان دارد" سے زیادہ ترقی پر اُبھارنے والا اور کوئی مطمح نظر نہیں ہو سکتا۔ میں بوثوق کہتا ہوں کہ جب تک مسلمانانِ ہند اس دستور العمل پر کاربند تھے ہر قوم اُن کی عزت کرتی تھی اور وہ ہر قسم کی نیکی و شرافت کے مظہر تھے لیکن بعد میں جب اُن کے اس اعتقاد میں تنزل

پیدا ہوگیا تو اُن پر ادبار کی گھٹائیں چھاگئیں۔ پہلے تو وہ "قول مرداں جاں دارد" کے معتقد تھے لیکن اس کے بعد اُن کے اعتقاد میں جو تبدیلی پیدا ہوئی وہ اس مصرعہ سے ظاہر ہوتی ہے ؎

"وعدہ آسان ہے وعدہ کی وفا مشکل ہے"

یہ مصرعہ ایک بیّن انقلاب کا مظہر ہے لیکن اس سے بھی زیادہ وضاحت اور اختصار کے ساتھ یہ تبدیلی ذیل کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے جو یہ ہیں کہ: ؎

"وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہوگیا"

حضرات! میرے خیال میں یہ ضروری نہیں ہے کہ اس انقلاب پر ادبی پہلو سے کامل بحث کی جاوے اور ان فقرات کو مسلمانانِ ہند کے انحطاط و تنزل کے مختلف درجات کا قطعی مظہر قرار دیا جاوے لیکن میرا اعتقاد ہے کہ اگر کسی قوم کے خیالات کا اندازہ اُس کی نظم، اُس کی ادبیات اور روزانہ زندگی کے اعمال سے ہوسکتا ہے تو ان مصرعوں سے اُس مردانگی اور خودداری کے تنزل اور انحطاط کا پتہ چلتا ہے جس نے قرونِ اولے میں ہمارے آبا و اجداد کو امتیاز بخشا تھا اور احساس فرض کا آلہ ہونے کی حیثیت سے جس کی بنیاد مذہبی تربیت یافتہ قلوب میں بڑے استحکام سے قایم تھی۔ مذہبی تربیت اخلاقی جرأت کے حصول پر اُبھارتی ہے اور اخلاقی جرأت و خودداری ۔ عزت نفس کا مادہ پیدا کرتی ہے۔ جن اُردو مصرعوں کا میں پہلے ذکر کرچکا ہوں اُن کا قرآن کریم کی اس آیتہ سے مقابلہ کرو۔

وا وفوا بالعهد ان العهد كان مسؤلا

یقین کیجئے کہ ہمارے نصف مصائب کا باعث متانت و عزت نفس کا فقدان ہے۔ میرے نزدیک یہی وہ صفات ہیں جو تمام اوصافِ حسنہ اور ہمدردی بنی نوع کی جڑ ہیں۔ بے شبہ یہ صفات اس شریف حب وطن کا سرچشمہ ہیں جو ایک جماعت میں قوت تحریک پیدا کرتی ہے اور اس کے خیالات کو بلند بنا دیتی ہے اور جس پر کاربند ہوکر لوگ مردانہ وار اپنے فرائض ادا کرتے اور دیانت و متانت اور انصاف کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اپنے حقداروں کی ترقی کے لئے تمام اُن مواقع سے جو اُنھیں حاصل ہوں پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ اوصاف ہیں اُن بزرگوں کی مثال اور یاد تازہ رکھنے کے قابل بناتے

ہیں جو اگرچہ اب دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن وہ ایک ایسا زبردست اثر اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں کہ وہ ایک لازوال میراث ہے جس کا اثر ہر شے میں جلوہ افگن ہے اور ہمارے لئے نشانِ قدم کا کام دیتی ہے۔ یہ ہماری اور خود اسلام کی خوش قسمتی ہے کہ مسلمانوں میں اپنی اصلی حیثیت کو سمجھنے کا میلان پیدا ہو رہا ہے اور یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ اب تمام اقطاعِ ہند کے مسلمان متحدہ طاقت سے نہ صرف خرابیوں کا مقابلہ کر رہے ہیں بلکہ اُس نقصان کی تلافی کے لئے کوشاں ہیں جو گزشتہ نصف صدی میں انھیں پہنچا ہے اس بیداری کی بیّن علامت آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا وجود ہے جو زندۂ جاوید سر سیدؒ کی قابلیت اور دور اندیشی سے معرضِ وجود میں آئی اور اسی کے ساتھ شعبۂ نظم کی وہ مخصوص ترقی ہے جو علی گڑھ تحریک کے دوش بدوش شروع ہوئی اور جس کے بانی مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی جیسے بزرگ ہیں۔

تعلیمی عقدہ ہنوز حل طلب ہے

حضرات! مسئلہ تعلیم ایک نہایت وسیع الحدود مسئلہ ہے۔ تعلیم کی نوعیت اور طریق تعلیم یہ دونوں ایسے سوال ہیں جو ترقی یافتہ مغرب میں بھی کوئی قطعی صورت اختیار نہیں کر سکے۔ اس حیران کن عقدہ پر فضلا و ماہرین سیاست نے بہت کچھ بحث کی ہے۔ بے شمار نقاد موجودہ طریق کو قابلِ تنسیخ قرار دے چکے ہیں اور ایک کثیر التعداد گروہ ایسا بھی ہے جو اسے اب تک تھامے ہوئے ہے اور جس کے خیال میں یہ بہترین اور موافق ترین طریق ہے۔ اس کے ساتھ ہی اکثر ماہرین فن کی یہ رائے ہے کہ آیندہ تعلیم میں مذہبی اور اخلاقی پہلو غالب رہنا چاہئے اور اس میں یہ خصوصیت نمایاں ہونی چاہئے کہ وہ عملی زندگی کی ضروریات کے موافق ہو۔ اس اختلاف آراء نے ایک بحث کی صورت پیدا کر دی ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ اب تک بھی کوئی ایسا طریق متیقن نہیں ہو سکا جس کے مطابق آیندہ تعلیم کی نوعیت کا فیصلہ کیا جا سکے۔ میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ ہماری قوم کے لئے جسے غربت یا افلاس یا ایک ایسی حالت نے جو سیاسی تنزل کے بعد ظہور پذیر ہوا کرتی ہے بڑی سختی سے دبا رکھا ہے۔ مختلف تعلیمی اصولوں کا عملی تجربہ یا جدید اور غیر آزمودہ طریقوں کا اجرا ایک ایسی بدعنوانی ہوگی جس کے بدنتائج کی وہ کسی صورت میں بھی تاب نہیں لا سکتی۔

ہم کو مقررشدہ دستور العمل پر عامل ہونا لازم ہے

ہمیں لازم ہے کہ تمام مقاصد و اغراض کے لئے اسی دستور العمل پر چلیں جو مقرر شدہ ہے، اُس میں صرف اسی قدر ترمیمات کر لیں

جو ہماری قوم کی خاص ضروریات کے مناسب حال ہوں۔ میرے اس بیان سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میرا مطلب اس سے یہ ہے کہ گورنمنٹ کی پالیسی تعلیم کے متعلق درست اور راسخ ہے یا یہ کہ ہم کو پس و پیش کا کچھ لحاظ نہ رکھنا چاہیئے اور یہ نہ دیکھنا چاہیئے کہ اس نے ہم پر کیا اثر کیا ہے۔ میرے خیال میں گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی کا لب لباب صاف طور سے اُن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جو انڈین ایجوکیشنل پالیسی (مطبوعہ گورنمنٹ آف انڈیا ۱۹۰۴ء) سے میں اخذ کرتا ہوں:-

"طریقۂ تعلیم میں جس کا اس طرح رواج دیا گیا ہے اُن تمام دماغی ترقیات کے لئے جو ایک مہذب قوم کے شایانِ شان ہوں، مختلف مدارج کے لحاظ سے سامان موجود ہے۔ اس سے تعلیم تفحص (ریسرچ) کے متعلق طلبا کی تمام خواہشات قابل اطمینان طور پر پوری ہوتی ہیں۔ اس سے گورنمنٹ کے لئے متدین اور ہوشیار ملازم بہم پہنچتے ہیں۔ اس سے ایسے کاریگر تیار ہوتے ہیں جو ہر ایک شعبہ تجارت کے لئے جو ہندوستان میں مستحکم طور پر قایم ہو گئی ہے کارآمد ہوتے ہیں۔ اس سے ملک کے ذرائع ترقی کو امداد پہونچتی ہے اور فنونِ لطیفہ اور صنعت و حرفت کو ترقی ہوتی ہے۔ اس سے ملک کی ہر ایک جماعت کو اُن کی ضروریاتِ زندگی کے مناسب حال تعلیم ہوتی ہے، اور ان اغراض کے حصول کے لئے یہ طریق تعلیم ایسے طور پر مدوّن کیا گیا ہے جس سے تعلیم غیر محدود طور پر پھیل سکتی ہے کیونکہ تعلیم کی مانگ بڑھتی جاتی ہے اور حکومت اور پبلک کی طرف سے ایک بڑے پیمانے پر فیاضانہ امداد ملتی جاتی ہے۔"

یہ پالیسی جناب گورنر جنرل باجلاس کونسل نے ۱۹۰۴ء میں ظاہر کی تھی، اور یہی پالیسی آج کے دن تک چلی آتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ گورنمنٹ کی پالیسی جہاں تک کہ وہ خاص مختص ضروریات پر مؤثر ہے، سخت درشت نہیں ہے۔

مذہبی تعلیم | یہ صاف عیاں ہے کہ گورنمنٹ بھی اس امر کو تسلیم کرتی ہے کہ اُس کی پالیسی "غیر محدود وسعت" کی محتاج ہے۔ بعض بڑے بڑے اصول کے لحاظ سے البتہ ہم کو اس عام طرز تعلیم کے ساتھ ساتھ چلنا پڑے گا جو ہندوستان میں مروّج ہے لیکن اس سے ہمیں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ ہم اس کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال دیں جس سے کسی ایسی قوم کی ضروریات پوری ہو کر

جس کے مذہبی اور اخلاقی خیالات کی بنا اس کی قدیمی روایاتِ قومی پر ہو اور وہی اس کی بہترین پونجی ہو۔ میرا اعتقاد ہے کہ یہ ایک دستور ہوگیا ہے کہ جو شخص اس بات پر زور دیتا ہے کہ طریقہ تعلیم میں مذہبی تعلیم کو ممتاز درجہ اور اونچی جگہ ملنا چاہئے اس پر خوب لے دے کی جاتی ہے۔ ایک ایسے زمانہ میں جیساکہ زمانہ موجودہ ہے جس میں فیشن اور دستور کے شور و شغب سے لوگوں کا اکثر ناک میں دم کیا جاتا ہے مجھے شک ہے کہ کہیں میرے اُن مذہبی خیالات پر جو میں نے ظاہر کئے ہیں یہ فتویٰ تو نہیں لگا دیا جائے گا کہ یہ ایک ملا آدمی کے خیالات ہیں یا ایسے خیالات ہیں جن میں دیوانگی کا اثر پایا جاتا ہے۔ لیکن مسلمانِ ہند کے اوج ترقی پر پہنچانے کے متعلق آپ کے کچھ ہی خیالات کیوں نہ ہوں اور اس کے متعلق آپ کی تجاویز کچھ ہی قرار کیوں نہ دی گئی ہوں مجھے یہ عرض کرنے میں کچھ بھی تامل نہیں ہے اور میں نہایت زور کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہم بہترین علمی انسان اور بہترین فرد قوم اور عظیم الشان سلطنت کے بہترین شہری اُسی وقت بن سکتے ہیں جب کہ ہمیں اُس تعلیم کے ساتھ ساتھ جو سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے۔ مذہبی تعلیم و تربیت بھی کافی طور پر دی جاوے۔ میری تو یہ قطعی رائے ہے کہ قومی ذہنی کی تعلیم و تربیت جو مذہب سے معرّا ہو یا زیادہ صحت کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ تعلیم جس کا باگ مذہب کے ہاتھ میں نہ ہو وہ زیادہ سے زیادہ ایک قابل اعتراض ذہانت و جودت طبع پیدا کرتی ہے۔ تعلیم جو مذہب سے معرّا ہو وہ ایسے آدمی پیدا کرتی ہے جو ذہانت کے پہلوان کہلاتے ہیں۔ جس شخص کو اچھی طور سے مذہبی تعلیم دی گئی ہو خواہ وہ کسی فرقہ کا آدمی ہو (کیونکہ میرا اعتقاد ہے کہ تمام مذاہب کے بنیادی اصول جو اچھے طریقے سے سکھلائے گئے ہوں حقیقتاً ایک ہی ہوتے ہیں) وہ ایک ایسا فرد ہوتا ہے جس کے اندر ایک ایسی طاقت کام کرنے والی ہوتی ہے جو اُس کے قلب پر حکمرانی کرتی ہے جو نیک خیالات، صالح ایمان اور نیک زندگی بسر کرنے کی تحریک کی قوت کا منبع ہے۔ اور یہی وہ کارکن طاقت و قوت تھی جو گزشتہ صدیوں میں شہرآفاق بہادرانِ اسلام میں جاری و ساری تھی۔ یہی وہ چیز تھی جس نے جاں نثارانِ پیغمبر علیہ السلام اور علم برداران اسلام کو ہر بات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے ہر مصیبت کو برداشت کرنے اور ہر طرح کا ایثار کرنے اور اپنے فرض کی انجام دہی میں مذبذب نہ ہونے کے قابل بنا دیا تھا، اور یہی وہ زبردست مذہبی اور اخلاقی جذبہ ہے جس کی بدولت پیروان پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام عام انسانی گروہ سے بڑھ کر ممتاز نظر آتے ہیں اور جب ہم ان کے سوانح اور حالاتِ زندگی پڑھتے ہیں تو اپنے آپ کو ان کے

مقابلہ میں ایسے پست درجہ پر پاتے ہیں کہ ہمارا خون خشک ہوتا ہے۔ دل بیٹھ جاتا ہے اور اعضا میں رعشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ہم کو سرتاسر ایسی خوبیوں اور اوصاف سے متصف نظر آتے ہیں جو کسی قوم کے فخر اور افتخار و اعزاز کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ مثل منور اور روشن تاروں کے ہر زمانے اور ہر وقت میں تاباں اور درخشاں رہیں گے۔ ان کے کارناموں کی تابانی سے تاریخ کے صفحات منور ہیں اور ہم کو اس امر کا پرزور احساس دلاتے ہیں کہ ایک زمانہ میں اُن کا وجود تھا اور وہ جامۂ حیات میں تھے۔ کوئی شخص ایک لمحہ کے لئے بھی معقولیت کے ساتھ اس امر کا ادعا نہیں کر سکتا کہ علوم مشرقیہ اور مذہبی تربیت کی کافی استعداد لائق اور شایستہ افراد پیدا کرنے سے قاصر ہوگی۔ دور کیوں جاتے ہو۔ آپ تسلیم کریں گے کہ سر سید احمد، نواب وقار الملک اور ایسے ہی دیگر بزرگوں نے آپ کی یونیورسٹی سے کوئی استفادہ حاصل نہیں کیا۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ کسی کو اس میں کلام نہ ہوگا کہ یہ لوگ عام انسانوں سے بالاتر ہیں۔ اور ایسے بالاتر کہ جو اپنی شخصیت اور قوت کے نشان ہماری جماعت کے اخلاق پر چھوڑ گئے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ان کی تعلیم کس قسم کی ہوئی تھی؟ محض قومی تعلیم یا زیادہ صحت کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خالص مشرقی تعلیم، اور اگرچہ ان کو بجا طور سے ذہانت اور قوت دماغی کے لحاظ سے عام انسانوں سے بالاتر درجہ دیا جاتا ہے مگر اُن کی تعلیم و تربیت کی بنیاد عربی و فارسی ہی پر تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ میں سے بعض حضرات مجھکو اس فلسفیانہ معمے سے خاموش کرنا چاہیں گے کہ وہ لوگ زمانہ کے ارتقا کا نتیجہ تھے، لیکن میں عرض کروں گا کہ اُن کی ذہانت و فطانت کی عمارت کی بنیاد میں مشرقی تعلیم اور محض مشرقی تعلیم ہی تھی۔

حضرات! میں اس موقع پر زمانۂ حال کی تعلیم کے برخلاف وعظ نہیں کہتا۔ مجھ کو مغربی تعلیم کے فوائد کا بخوبی احساس ہے حقیقت یہ ہے کہ ممکن نہ تھا کہ بغیر مغربی تعلیم و تہذیب کے مسلمانانِ ہند اپنے تنزل و انحطاط کی روک تھام کر سکتے، جس میں وہ اُن تعصبات اور ضعیف الاعتقادی کی بدولت گرتے چلے جا رہے تھے جو اُن کی سیاسی قوت کے جاتے رہنے سے اُن میں پیدا ہو گئے تھے اور جو اُن کی جماعت کو اندر ہی اندر گھن کی طرح برباد کر رہے تھے میرا در حقیقت یہ اعتقاد ہے اور اس میں تخالف رائے کی گنجائش نہیں ہے کہ اگر ہم بحیثیت قوم کے چاہتے ہیں کہ زندگی کی تگ و دو میں دیگر اقوام کے مقابل اپنی ہستی کو قایم و برقرار رکھیں تو ہمارے نظام تعلیمی میں زمانہ موجودہ کی تعلیم و تربیت کو اول جگہ ملنا چاہئے۔ لیکن میں عرض کروں گا اور پورے اعتقاد کی بنا پر عرض کروں گا کہ من حیث القوم ہم اپنی شخصیت و جداگانہ حیثیت کو کھو بیٹھیں گے اگر

ہم نے اس تجویز کی مغربی تعلیم و تربیت کے ساتھ اپنی مذہبی تعلیم کو جس کی بنیاد قرآن و حدیث پر ہے کافی طور سے باہم آمیز کرنے کی، ظاہر ہے کہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں ہم کو کوئی ایسی تعلیم جو مذہبی ہو نہیں مل سکتی لیکن مجھے اس امر کا کامل یقین ہے کہ خود ہمارے قومی کالجوں اور اسکولوں میں ہمارے لئے کوئی امر مانع نہیں ہے کہ ہم اس کو بہترین شکل میں مہیا کر سکیں، اور اس موقع پر میں اپنا دلی خیال آپ کو بتاتا ہوں، یعنی اس شخص کا دلی خیال جس نے پرانی روایات کی بنا پر تعلیم پائی ہے اور جو زمانہ حال کی تہذیب و شائستگی سے بھی کوئی بغض و عناد نہیں رکھتا کہ اگر اس خصوص میں آپ کی مجوزہ یونی ورسٹی انتظام کرنے سے قاصر رہے گی تو وہ اپنے اس حقیقی مطلب و مدعا میں ناکام رہے گی جس کی بدولت وہ قوم کی نظروں میں ہردلعزیز، مفید اور تمام قوم کے لئے فائدہ رساں اور عملی کام کرنے والی ثابت ہوگی، مزید برآں میں عرض کروں گا کہ آپ کی مجوزہ یونی ورسٹی کی مشرقی تعلیم کا پہلو نہایت مستحکم اور مضبوط ہونا چاہئے اور عربی تعلیم و دینیات کی ڈگری کے لئے وسیع سہولتیں اور سامان مہیا ہونے چاہئیں۔

| تعلیم عربیہ بمقابلہ فارسیہ

میں عربی علم ادب کو پیروان اسلام کی تعلیم کے حق میں نہایت قیمتی خیال کرتا ہوں اور میں اس کو فارسی پر جو مغلوں کی حکومت میں عدالتی زبان تھی قطعی طور سے ترجیح دیتا ہوں۔ شاہان مغلیہ کے وقت میں ہماری کتب دینی اور دینیات کا علم فارسی زبان میں نہیں تھا بلکہ عربی زبان میں تھا اور فارسی کی حیثیت اس وقت وہی تھی جو اس وقت ہندوستان میں انگریزی زبان کی ہے، یعنی ملک کی عدالتی زبان۔ فارسی کا کام اب انگریزی نے لے لیا ہے اور اس لئے میری رائے ہے کہ اسے ترک کر دینا چاہئے اور عربی زبان کو اپنے نصاب تعلیم میں داخل کرنا چاہئے۔ مجھے اس امر سے انکار نہیں ہے کہ فارسی نے عربی کے اختلاط سے علم ادب پر بہت عمدہ اثر ڈالا ہے۔ ہماری قوم کے بہت سے افراد انگریزی اور عربی کو پڑھیں اور کسی دوسری مشرقی زبان کا بوجھ نہ اٹھائیں، جس کے شمول سے زندگی کی دوڑ میں ہمارے لئے رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ میں اس سوال پر بحث کرنے سے کہ قوم کو مذہب کی اور عربی کی تعلیم کے لئے کن ذرائع اور طریقوں کو اختیار کرنا چاہئے، بلا ضرورت آپ کی سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا۔ یہ تفصیلات ہیں اور مجھے یقین ہے کہ جب مختلف شعبہ ہائے تعلیم کے نصاب کی اسکیمیں مدون ہونگی اس وقت ان پر مناسب طور سے توجہ کی جائے گی۔ عربی اور مذہبی تعلیم کو ترقی دینے کے لئے

جو طریقے میرے ذہن میں آتے ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ دیسی مکاتب اور مدارس قرآنی کی توسیع کی جاوے۔ بنگال میں ڈاکٹر راس کی تحریک پر جو کئی سال سے کلکتہ مدرسہ کے پرنسپل تھے اور اب آخر میں گورنمنٹ ہند کے ہوم ڈیپارٹمنٹ کے اسسٹنٹ سکرٹری ہیں۔ گورنمنٹ بنے بڑے بڑے دیہات میں مکاتب و مدارس قرآنی کے اجرا کا کام کرنا شروع کیا ہے یہ انتظام فی الحال بطور آزمائش کے ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر اس کا انتظام عمدہ طریقے سے چلایا گیا اور گورنمنٹ کی طرف سے جو تقویت اور امداد مل رہی ہے وہ ملتی رہی تو اس سے مسلمانوں کی مذہب کی ابتدائی تعلیم کی اشاعت اور اُن کی قومی خصوصیات کی تقویت کے لئے عمدہ نتائج مترتب ہوں گے۔

ایک تندرست اور خود دار قوم بننے کی شرائط

حضرات! اگر میں نے مذہبی تعلیم کے متعلق لمبی چوڑی تقریر کی ہے تو محض اس وجہ سے کہ مجھے اس امر کا یقین واثق ہے کہ کسی قسم کی بھی تعلیم سے جو اس نام کی مصداق ہو آخر الامر وہ باتیں نہیں پیدا ہو سکتیں جو ایک قوم کو تندرست مضبوط اور خوددار بناتی ہیں۔ آپ صاحبوں کا جو کچھ بھی خیال ہو وہ ہو، میرا تو یہ خیال ہے کہ جس تعلیم میں مذہبی تعلیم شامل نہ ہو اس سے اعلیٰ صفات کے انسان پیدا نہیں ہو سکتے۔

چونکہ ایک دن ہماری اپنی یونی ورسٹی ہوگی، اس لئے میرے خیال میں یہ بے محل نہ ہوگا اگر میں چند الفاظ اُن موٹے موٹے اصولوں کے متعلق عرض کردوں جن پر یونی ورسٹی کو کاربند ہونا چاہیئے۔ لنڈن ٹائمز کے ایک مضمون سے جو بظاہر ایسے شخص کے قلم سے معلوم ہوتا ہے جو ہندوستانی یونی ورسٹیوں کے نظام تعلیم کا ماہر ہے۔ میں حسب ذیل الفاظ کا اقتباس کرتا ہوں:۔

> خالص ذہانت کے نکتہ خیال سے (اور اسی پر آج ہم بحث کرنا چاہتے ہیں) اگر ہندوستانی یونی ورسٹیوں کی حالت کا پورا معائنہ کیا جاوے تو نہایت تکلیف دہ ثابت ہوگا۔ اپنی خواندہ آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ یونیورسٹی گریجوئیٹوں کی اس تعداد سے بہت زیادہ تعداد رکھتا ہے۔ جو اس کی یا کسی دوسرے ملک کی ہے۔ لیکن اس پیداوار کی قابلیت او سط کے لحاظ سے افسوس ناک طور پر پست ہے اور مستقل طور پر کم ہوتی جاتی ہے.......

فی الواقع بات یہ ہے کہ ایک طرف تو مصنوعی امتحانات نے ہندوستانی تعلیم کو جو یونیورسٹیوں

میں دیہاتی پوکامل طور سے غلبہ پالیا ہے اور نکما کر دیا ہے اور دوسری طرف کتب درسیہ نے جو طلبا کے قوت یادری کو جانچتے ہیں نہ اُن کی ذہانت کو۔ نتیجہ یہ ہے کہ بعض طباع اور ذہین طالب علم اس غیر مفید اور سخت طریقہ تعلیم کے جکڑبند توڑ کر اُبھر جاتے ہیں لیکن ایک کثیر تعداد "کتب درسیہ کی غلامی اور امتحانات کے جکڑبندوں کا آہستہ آہستہ شکار ہو جاتے ہیں"۔ مجھے اُمید ہے کہ ہماری یونی ورسٹی موجودالوقت یونی ورسٹیوں کی اندھی تقلید نہیں کرے گی۔ اور جب اس کے مقاصد اور ضوابط کے تدوین کا وقت آئے گا تو موجودہ طریقے کے نقائص وعیوب کو فراموش نہیں کر دیا جائے گا۔

اعلیٰ تعلیم استحکام حاصل کر چکی ہے

یونی ورسٹی کا نظام تعلیم جس سے میری مراد اعلیٰ تعلیم سے ہے، خواہ وہ برا ہے یا بھلا اس ملک میں استحکام پکڑ چکا ہے۔ اس پر صرف خوردہ گیری کرنا ہی کافی نہیں بلکہ اس کے نقائص کا پتہ لگانے، اُس کی اصلاح کرنے، اُسے مضرات سے پاک کرنے اور تمدن وعلم کی حقیقی ضروریات کے مطابق بنانے کی ضرورت ہے۔ اس موقع پر میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ معاف فرمائیں گے اگر میں اصل مبحث سے کچھ تجاوز کروں۔ رسالوں اور عام اخبارات میں جو کچھ نکتہ چینی اعلیٰ تعلیم کے ناقص ہونے کے متعلق کی جاتی ہے اس سے بعض لوگ یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ گورنمنٹ اس ملک میں اعلیٰ تعلیم سے دست کش ہونے کا کوئی بہانہ تلاش کر رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ گورنمنٹ نہ تو دست کش ہونا چاہتی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ جب کہ ایک مرتبہ اُس نے ہمیں ذہنی وعقلی حیثیت سے مغرب کا حصہ دار بنا دیا ہے تو اس کا یہ مقدس فرض ہے کہ وہ ہمارے اس حق کو برقرار رکھے اور اسے وسعت دے۔ نہ کہ اس کو محو کر دے۔ لارڈ میکالے نے (جو اس زمانے میں کونسل کے مشیر قانونی اور سررشتہ تعلیم کی مجلس کے صدر تھے) جو پالیسی ۱۸۳۵ء میں کورٹ آف ڈائرکٹرز نے اپنے مشہور مراسلے میں اس پالیسی کو وسعت دی تھی جس میں اُنھوں نے اس فیصلہ کا اعلان کیا تھا کہ گورنمنٹ کو ہندوستان میں مغربی تعلیم کی وسیع اور باقاعدہ ترقی مستعدی کے ساتھ امداد دینا چاہیئے۔ ۱۸۵۴ء میں لارڈ ڈلہوزی وایسرائے تھے اُس وقت سرچارلس ووڈ (جو بعد میں وائکونٹ ہیلیفیکس کہلائے) ان کا مراسلہ ہندوستان کے لئے ایک تعلیمی اسکیم پر مشتمل موصول ہوا۔ اس مشہور مراسلہ کے الفاظ حسب ذیل ہیں:۔

"...... کثیر التعداد اہم معاملات میں سے کوئی معاملہ مسئلہ تعلیم سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہے یہ ہمارا ایک مقدس ترین فرض ہے کہ جہاں تک ہمارے امکان میں

ہے۔ ہم ہندوستان پر اُن کا کثیر اخلاقی اور مادی برکات کے نزول کا ذریعہ بن جائیں جو علوم نافعہ کی عام توسیع و اشاعت سے حاصل ہوتی ہیں اور جو ہندستان انگلستان کے ساتھ اپنے تعلق سے حاصل کر سکتا ہے۔

اس سے ذرا آگے چل کر مراسلہ مذکور میں نہایت زور کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے کہ:۔

جس تعلیم کو ہم ہندوستان میں وسعت دینا چاہتے ہیں اس کا مقصد ترقی یافتہ علوم وفنون، سائنس۔ فلسفہ اور ادبیات یورپ یا بالفاظ مختصر یورپین علوم کا پھیلانا ہے......"

جب ملک کی عنان حکومت تاج برطانیہ کے ہاتھ میں آئی تو ۱۸۵۸ء میں اس پالیسی کی جس کی بنیاد وائکونٹ ہیلیفکس نے ۱۸۵۴ء میں ڈالی تھی دوبارہ توثیق کی گئی۔ میں آپ کو باور کراتا ہوں کہ اب اس پالیسی سے روگردانی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ برخلاف اس کے تعلیمی مصارف یوماً فیوماً زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ گزشتہ دس سال میں عام اخراجات چار کروڑ سے سات کروڑ تک بڑھ گئے ہیں۔ اس موقع پر مجھے یقین ہے کہ ان الفاظ کے اعادہ کے لئے مجھے معافی مانگنے کی حاجت نہیں، جو [illegible] اپریل [illegible] حضور شاہنشاہ معظم نے کلکتہ یونیورسٹی کے ایڈریس کے جواب میں ارشاد فرمائے تھے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جنھوں نے ہندوستان کے طول و عرض میں اُمید کی ایک برقی رَو دوڑا دی تھی۔ یہ الفاظ اعلیٰ دانش مندی، تدبر اور فیاضی پر مبنی ہیں اور یہ ایسے الفاظ ہیں جو ہر طالب ہندوستانی کو سونے کی تختی پر نقش کرا کے اپنے پاس رکھنے چاہئیں اور جو ہندوستان کی تعلیمی پالیسی کا نشان امتیاز ہیں۔

شہنشاہ معظم ہمارے تعلیمی مستقبل پر

ہز مجسٹی نے ارشاد فرمایا تھا:۔

"فی زمانا کوئی یونیورسٹی مکمل نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ علوم و فنون کے تمام اہم شعبوں کے متعلق تعلیمی فیکلٹیاں اور تحقیق و تدقیق کے پورے مواقع اُس میں مہیا نہ ہوں۔ تمہیں علوم قدیمہ کو محفوظ رکھنا ہے اور اسی کے ساتھ مغربی علوم کو ترقی دینا ہے۔ تمہیں کیرکٹر (سیرت) بھی پیدا کرنا ہے جس کے بغیر تعلیم کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی تم کہتے ہو کہ تم اپنی عظیم الشان ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہو میں اس کام کے لئے جو تم کو درپیش ہے خدا سے تمہارے لئے کامیابی کی دعا مانگتا ہوں۔ اپنے مطمح نظر کو بلند رکھو اور ان کی مساعی تکمیل میں فرق نہ آنے دو اور خدا کے فضل و کرم

سے تم ضرور کامیاب ہو گے۔ چھ سال قبل میں نے انگلستان سے ہندوستان کو ایک پیغام ہمدردی بھیجا تھا اور آج ہندوستان میں موجود ہو کر میں تمھیں نوید اُمید دیتا ہوں۔ ہر طرف مجھے نئی زندگی کے آثار اور علامتیں دکھلائی دیتی ہیں تعلیم نے تمھارے دلوں میں اُمید پیدا کی ہے اور اعلیٰ اور بہتر تعلیم سے تم کو اعلیٰ و بہتر اُمیدیں حاصل ہوں گی۔ میرے حکم سے دہلی میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ میرا نائب السلطنت باجلاس کونسل ہندوستان میں مصارف و ترقی تعلیم کے لیے بیش قرار رقوم وقف کرے گا۔ یہ میری آرزو ہے کہ ملک میں اسکولوں اور کالجوں کا ایک جال بچھا دیا جاوے جن سے وفادار، جواں مرد اور کارآمد شہری پیدا ہوں جو صنعت و حرفت، زراعت اور زندگی کے تمام دیگر شعبوں میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں۔

میری یہ بھی تمنا ہے کہ اشاعت و ترویج علم سے میری ہندوستانی رعایا کے گھر روشن و منور ہوں ان کی محنت و مشقت میں خوشی و خرمی پیدا ہو اور ان میں بلند خیالی، آرام و آسائش اور تندرستی و صحت کے تمام فوائد حاصل ہوں جو علم کے لوازمات میں سے ہیں۔ میری آرزو صرف تعلیم کے ذریعے سے پوری ہو سکتی ہے اور ہندوستان میں اشاعتِ تعلیم کا مقصد ہمیشہ میرے زیر نظر رہے گا۔

اِن سے زیادہ شریفانہ الفاظ اور شریف زبان نہ کبھی سنی گئی اور نہ بیان کی گئی ہے اور نہ گورنمنٹ کا رویہ اس سے کچھ مختلف ہے۔ تعلیم کے متعلق پنجسالہ رپورٹ جو ہز ایکسیلینسی لارڈ ہارڈنگ (یعنی وہ عالیشان اور فراخ دل مدبر جو اس وقت ہندوستان پر حکمران ہے) اس کے عہد حکومت میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں صاف اور صریح الفاظ میں گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی اس طرح بیان کی گئی ہے۔

یہ بیان کرنے کے بعد کہ یونی ورسٹیوں اور کالجوں کے نظام میں اصلاح شروع ہو گئی ہے اور پبلک فنڈ (سرمایۂ عام) سے غیر سرکاری تعلیم گاہوں کو جو امداد دی جاتی ہے وہ گزشتہ نو سال میں دو چند کر دی گئی ہے اس میں تحریر ہے کہ:۔

.......اُن عظیم الشان فوائد سے جو تعلیم نے ہندوستان کو بخشے ہیں نہ انکار کرنا

چاہئے اور نہ اُن کی قدر و قیمت گھٹانا چاہئے۔ غیر مکمل معلومات کی بنا پر جو نتیجات کی جاتی ہیں وہ اکثر غلط ہوتی ہیں مثلاً یہ قرین انصاف نہیں ہے کہ ہندوستانی طریقوں کا جو ابھی ابتدائی حالت میں ہیں مغربی دنیا کے موجودہ طریقوں سے جو تکمیل کو پہونچ چکے ہیں مقابلہ و موازنہ کیا جائے یا نظام تمدنی اور قوائے ذہنی کے اثرات کو نظر انداز کیا جاوے۔ مزید برآں یہ عام الزام کہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کی بنا عام تعلیم کی نازک اور کمزور بنیاد پر رکھی گئی ہے اور یہ کہ اس کے ذرائع ناکافی ہیں ایک ایسا الزام ہے جو یورپ کے ہر ملک پر کسی نہ کسی وقت میں لگایا جاسکتا تھا۔ ہندوستان ایسے منازل سے گزر رہا ہے جو دوسرے ممالک نے دوسرے زمانوں میں طے کئے ہیں۔

ذرا الفاظ ذیل پر غور فرمائیے:۔

.........اپنی پالیسی میں سب سے پہلے گورنمنٹ زیر تعلیم طلبا و انڈر گریجوئیٹس کے کیرکٹر (سیرت) کی تربیت کی خواہشمند ہے۔ سیرت کے پیدا کرنے میں گھر کے اثر اور معلم کی ذات کو بڑا دخل ہے۔ سابقہ تجربہ کی بنا پر اُس امید کی کافی وجہ موجود ہے کہ جوں جوں بہتر تعلیمی حالات کے زیر اثر تعلیمی آسانیاں بڑھتی جائیں گی سوشیل اصلاح کی صورت پیدا ہو گی۔ تعلیم نسواں پھیلے گی اور بہتر معلمین دستیاب ہو سکیں گے۔ اب تک مذہبی اور اخلاقی کافی امداد بھی دی جاچکی ہے اور اس اصلاح کے بہت وسیع معنی لئے گئے ہیں۔ یعنی بلاواسطہ مذہبی اور اخلاقی تربیت کے علاوہ بالواسطہ طریقوں پر بھی یہ مشتمل ہے جن میں ناصحانہ طریق، اجتماعی زندگی، روایات، انتظام ماحول، حفظانِ صحت کی بہتری اور تعلیم کا نہایت ضروری پہلو یعنی جسمانی تربیت اور نظام تفریح بھی شامل ہے۔

اس خیال کی ایک اور عملی تردید کہ گورنمنٹ تعلیمی حوصلہ افزائی کی طرف سے ہاتھ کھینچ لینا چاہتی ہے اسلامیہ کالج پشاور کے قیام میں موجود ہے۔ جو یہاں سے کچھ زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے اور جو سر جارج روس کیپل کی مہربانی اور کشادہ دلی اور صاحبزادہ عبدالقیوم صاحب کی حب وطن اور محنت کی یادگار ہے۔ پشاور میں اس تعلیمی تحریک کی اہمیت کے متعلق اشارہ کرتے ہوئے سر ہارکورٹ بٹلر نے فرمایا تھا کہ:۔

درۂ خیبر کے دہانہ کے سامنے ایشیا کے اس مشہور شاہراہ پر کھڑے ہو کر میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے تصور اور قوتِ متخیلہ پر اس آیندہ روشنی کا زبردست اثر پڑ رہا ہے جو اس اسکول اور کالج سے نہ صرف اس صوبہ میں بلکہ ایشیا کے دور دراز گوشوں میں منعکس ہو کر پھیلے گی۔

ہم نہایت جوش کے ساتھ یہ اُمید کرتے ہیں کہ سر ہارکورٹ بٹلر صاحب کا خواب پورا ہو گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں اس تازہ گراں قدر فیاضی کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہو گا جو اسلامیہ کالج لاہور کے متعلق کی گئی ہے یہ کالج زندہ دلانِ پنجاب اور بالخصوص انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایثار اور حبِ وطن کی زندہ مثال ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانانِ مدراس کی تعلیمی ترقی کے لئے مالی امداد اور کلکتہ مدرسہ کو اعلیٰ درجہ کے کالج تک پہونچانے کی منظوری ایک یونی ورسٹی ڈھاکہ میں اور دوسری پٹنہ میں قائم کرنے کا فیصلہ اور رنگون (ملک برہما) میں ایک تیسری یونیورسٹی کے قیام کی تجویز۔ یہ سب ایسے امور ہیں جن کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ اور اسی قسم کی دیگر تحریکات اس غلط فہمی کی تردید کے لئے کافی ہیں کہ گورنمنٹ کی آیندہ پالسی ہندوستان میں یونی ورسٹی کی تعلیم کی ترقی و اشاعت کو محدود اور کم کرنا ہے۔ اس کے لئے ضرورت ہو گی کہ تعلیم پر بڑی بڑی رقوم خرچ کی جاویں جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تعلیم گراں ہو جائے گی لیکن گورنمنٹ کا منشا یقیناً یہ نہیں ہے کہ تعلیم کو مٹا دیا جاوے، برخلاف اس کے یہ ظاہر ہے کہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم کو بہت اہمیت دی جا رہی ہے، اور نہ اعلیٰ حکام اور ماہران تعلیم کی رائیں ایسی تعلیم کی موافقت میں ہیں جو مذہب سے معرّا ہو۔ سر اینڈرو فریزر صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"ہمیں ایک اعلیٰ تر طریق کی خواہش ہے یعنی ایک ایسے طریق کی جو انسان کی اخلاقی اور مذہبی تربیت کے دوش بدوش ذہنی اور جسمانی تعلیم کو بھی حاوی ہو"

(ماخوذ از نائینٹینتھ سینچوری اکتوبر ۱۹۰۸ء)

مشہور مذہبی عالم اور ماہرانِ فنِ تعلیم ڈاکٹر ویلڈن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ ایسے انتہائی وثوق کے ساتھ جس کا اظہار مشکل ہے یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ محض دنیاوی تعلیم جہاں اور جس شخص کو بھی دی جائے گی اس کا نتیجہ قابلِ افسوس ناکامی کی صورت میں رونما ہو گا۔

اے حضرات! ملک معظم کی تقریر سے، مختلف سرکاری رپورٹوں کے اقتباسات سے اور ممتاز عہدہ دارانِ سرکاری کے آراء سے صاف ظاہر ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے متعلق قدم ہرگز پیچھے

نہیں ہٹایا جا سکتا۔ یہ تمام رائیں جس عقیدے پر متحد و متفق ہیں وہ یہ ہے کہ کوئی تعلیم جو مذہبی اور اخلاقی تربیت سے معرا ہو ۔ ضرور ناکام رہے گی۔ اس لئے میری یہ پختہ رائے ہے کہ مسلمانوں کی قوم کو جنھوں نے یونیورسٹی کی تحریک سے اپنی آیندہ نسلوں کی تعلیم کی خصوصیت اور تربیت کے حصول کا فیصلہ کر لیا ہے تو مذہبی تربیت کو نظرانداز نہ کرنا چاہئے۔ اب گزشتہ حالات کی طرف مراجعت نہیں ہو سکتی، لیکن جیسا کہ میں پیشتر عرض کر چکا ہوں، اس امر میں کچھ بھی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ آیندہ تعلیم گراں تر ہوتی جائے گی۔ بہتر مکانات، بہتر ساز و سامان، بہتر عملہ اور بہتر ماحول بلاشبہ آخرالامر تعلیم کی خاصیت کو ترقی دینے والے ثابت ہوں گے۔ اور اس سے اس چیز کا حصول زیادہ آسان ہو جائے گا جسے گورنمنٹ نے اپنی پالیسی کا "مقصد اولین" قرار دیا ہے۔ لیکن یہ صورت مسئلہ بہ نسبت سابق زیادہ اخراجات کی موجب ہو گی اور یہ امر مسرت خیز ہے کہ گورنمنٹ نہ صرف اس حیثیت سے واقف ہے بلکہ ان روایات کے مطابق جو ایک روشن ضمیر، فیاض اور ترقی کن حکومت کے لئے مخصوص ہوتی ہیں وہ اس سوال کے مالی پہلو پر توجہ کرنے کے لئے بھی تیار ہے۔

اب میں اس حالت کے متعلق عرض کرتا ہوں جو اعلیٰ تعلیم میں ہماری ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ اگرچہ ابتدائی تعلیم میں من حیث القوم ہماری حالت کسی قدر بہتر ہے لیکن اعلیٰ تعلیم میں ہم دیگر اقوام کے مقابلہ میں بہت پس ماندہ ہیں۔ تلافی مافات کی سخت ضرورت ہے۔ آرٹس کالجوں میں ہمارا اوسط صرف ۴ر۱۰ ہے یعنی کالج کے ہر سو طالب علموں میں سے صرف دس مسلمان ہیں۔ کسی پیشہ کی تعلیم دینے والے کالجوں میں یہ اوسط اور بھی کم ہے یعنی صرف دس ہے۔ ثانوی تعلیم میں بھی ہماری حالت کچھ اچھی نہیں ہے اور تعلیم کے مدارس میں ہر سو میں صرف ۱۹ طلبا مسلمان ہیں۔ عام تعلیم گاہوں میں بھی مسلمان طلباء کی تعداد دیگر اقوام کے مقابلے میں حوصلہ افزا نہیں ہے۔ صوبہ وار تفصیل پر اگر غور کیا جائے تو صوبہ مدراس میں ہر سو طالب علموں میں سے مسلمان تو ہیں بمبئی میں ۱۶، بنگال میں تقریباً ۱۸، ممالک متحدہ میں ۱۵، پنجاب میں ۲۸، برہما میں ۳، مشرقی بنگال و آسام میں ۲ ■، ممالک متوسط و برار میں ■ کرگ میں ۲ اور صوبہ شمال و مغرب سرحدی میں ۴۲ صرف شمال و مغرب سرحدی و مشرقی بنگال و آسام ہی وہ صوبے ہیں جس میں مسلمانوں کا اوسط زیادہ ہے اور اس طرح پر یہ امر ظاہر ہے کہ اعلیٰ تعلیم میں ہنوز ہماری

حالت بہت پست ہے اور ضرورت ہے کہ تلافی مافات کرنے اور دیگر اقوام ہند کے دوش بدوش ہونے کے لئے مستقل اور زبردست جدوجہد سے کام لیا جاوے۔

حضرات! ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے جو اگرچہ ابتدائی تعلیم سے علاقہ نہیں رکھتا لیکن بالآخر اس سے گہرا تعلق رکھتا ہے وہ یہ کہ تعلیم کی مجموعی اور آخری صورت کیا ہونا چاہیئے؟ میں یہاں اس امر کے فلسفے پر بحث کرنا نہیں چاہتا کہ علم کو علم کی خاطر حاصل کیا جاوے۔ یہ ایسا مبحث ہے جس کو میں دیگر حضرات کے لئے چھوڑتا ہوں۔ لیکن میرے نزدیک جب ایک شخص کو خوراک کی حاجت ہو تو فلسفہ اس کے لئے وجہ تسلی نہیں ہو سکتا اور اگر ہم ایک بھوکے اور قحط دیدہ گرسنہ کے دل کو افلاطون کے اصول فلسفے کے بیان سے تسلی دینا چاہیں تو یہ وہ بات ہو گی کہ ایک گدا گر کے ہات میں جو روٹی کے لئے چلا رہا ہو ہم پتھر کا ٹکڑا رکھ دیں۔ میں دوسرے ممالک کی بابت تو جانتا نہیں کہ وہاں حالات مختلف ہیں، لیکن ہندوستان کی حالت کے لحاظ سے بالعموم ہمارے لئے سوائے اس کے اور چارۂ کار نہیں ہے کہ ہم اُس قسم کی تعلیم کے حصول کی جدوجہد کریں جو طنزاً "دال روٹی" کی تعلیم کہلائی جاتی ہے۔ اگر ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا بیشتر حصہ سرکاری ملازمت میں داخل ہوتا ہے تو میرے خیال میں اس کا سبب نتائج تعلیم کے متعلق فلسفیانہ خیالات کی کمی نہیں ہے بلکہ اس قسم کے اقتصادی حالات ہیں جو دیگر معاملات کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ ناقابل تسخیر ثابت ہوئے ہیں۔ ہندوستانی تعلیم کے اس پہلو کے متعلق لارڈ کرزن کی جو رائے تھی وہ گورنمنٹ ہند کے رزولیوشن مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۱۲ء میں بالتفصیل مذکور ہے اور اس رزولیوشن کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

"......مختلف اسباب نے، جن میں سے کچھ تو تاریخی اور کچھ اجتماعی ہیں، باہم مل کر بہ نسبت انگلستان کے ہندوستان میں نمایاں صورت میں یہ نتیجہ پیدا کیا ہے کہ اکثر طلباء جن سے اعلیٰ مدارس اور یونی ورسٹیاں معمور ہیں، اپنے تئیں حصول معاش کے قابل بنانے کی غرض سے داخل ہوئے ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ سرکاری ملازمت کو زیادہ قابل وثوق، زیادہ معزز اور زیادہ پسندیدہ طریق معاش خیال کرتا ہے اور طلبا کی طرف سے ان کثیر التعداد منافع کی آرزو ان اسکولوں اور کالجوں کو لمبے اُن مناسب فرض کی ادائگی کے مانع آتی ہے جو آزادانہ تعلیم کے مخزن کی حیثیت سے اُن پر عائد ہے۔ اِن وجوہ کی بنا پر بارہا اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ

ہندوستان میں تعلیم کے اعلیٰ فوائد کو اس رائج الوقت طریق سے سخت نقصان پہنچ رہا ہے کہ سرکاری ملازمت کے امیدواروں کا انتخاب یونیورسٹی اور اسکول کی سندات پر منحصر رکھا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس پہلو میں یہاں تک ترقی کی ہے کہ اُن کے خیال میں اگر سلطنت سے یہ مادّی تعلقات منقطع ہو سکیں اور انگلش سول سروس کمیشن کے طریق پر ایک خاص بورڈ کے ماتحت پبلک سروس کے متعلق الگ امتحانات مقرر کئے جا سکیں تو تعلیمی معیار بہت بلند کیا جا سکتا ہے۔ ...."

لارڈ کرزن کی گورنمنٹ نے اس رائے کو قبول نہیں کیا لیکن مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میری اس رائے سے متفق ہوں گے کہ موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سوال ضرور قابل بحث ہے کہ آخر ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان کیا کرنے والے ہیں؟ یہ تو محال ہے کہ سب کے سب سرکاری ملازمت اختیار کریں۔ ان میں سے اکثر قانونی پیشہ اختیار کر سکتے ہیں، جس میں اگرچہ پہلے ہی سے بہت کچھ اژدحام ہے۔ تاہم مسلمانوں کے لئے جگہ نکل سکتی ہے۔ بہت سے انجنیری کے پیشے میں جا سکتے ہیں، جس میں ہماری معدومیت شہرۂ آفاق ہے اور بہت سے طب کے پیشے میں داخل ہو سکتے ہیں جس میں ہمارا وجود برائے نام ہے۔ لیکن بایں ہمہ ایسے گریجوئیٹس کی ایک کثیر تعداد باقی رہے گی جنھیں مناسب جگہ ملنے کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی، اور جوں جوں ہر سال مختلف یونی ورسٹیاں تعلیم یافتہ طبقہ میں اضافہ کرتی جاتی ہیں اُن سب کے لئے حصول معاش کا مسئلہ نہایت ضروری اور سخت مشکل صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اس سوال نے پہلے ہی ہمیں بہت کچھ متفکر کر رکھا ہے۔ اور اگر ہم نے اسے حل کرنے کی کوشش کی تو عنقریب سخت مشکل حالات کا مقابلہ ہوگا۔ میں مایوس نہیں ہوں مگر میرا خیال ہے کہ ہمیں زندگی کے دوسرے طریقوں کی طرف بھی متوجہ ہونا چاہیئے اور اس کوشش میں کامیاب ہونے کے لئے میری رائے میں ضروری ہے کہ تعلیم کو ایسی صورت میں لایا جائے جو زیادہ تر عملی ہو اور ضروریات زندگی کے لئے زیادہ موافق ہو۔

صنعتی و حرفتی تعلیم ہم ذہنی قابلیت کے انعام جیتنے کی سعی و کوشش میں اس قدر منہمک ہیں کہ صنعت و حرفت کے متعلق ہم پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں اُن کی طرف سے قطعاً غافل ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مسٹر ٹاٹا اور دیگر ملک التجار حضرات کے ہم ممنون احسان ہیں جو ہندوستان کی سب سے زیادہ حوصلہ مند قوم یعنی پارسیوں سے تعلق رکھتے ہیں کہ انھوں نے ایک صنعتی تعلیم گاہ کے قائم کرنے کے

علاوہ لائق اور منتخب ہندوستانیوں کو صنعت وحرفت و دستکاری و فنون کی تعلیم کے لئے ممالک غیر میں بھیجنے کی غرض سے متعدد انتظامات کر رکھے ہیں۔ پنجاب میں ہندو جوبلی ٹیکنکل انسٹیٹیوٹ قائم ہے۔ لیکن مجھے یقین نہیں آتا کہ اس کے مقابلہ میں ہمارا ابھی کوئی اسکول ہو۔ بنگال میں رائے بہادر نریندر ناتھ سین اور سر چندر مادب گھوش کے فرزند بابو جے سی گھوش جیسے اصحاب کی مسلسل مستعدی کی بدولت صنعتی تعلیم کی ترقی کے لئے ایک انڈین ایسوسی ایشن قائم ہے جو مفید کام کر رہی ہے اور جو ہر سال طلبا کی جماعتیں صنعت کے متعلق علمی اور عملی معلومات حاصل کرنے اور آخرالامر حرفت کا کوئی شعبہ اختیار کرنے کی غرض سے انگلستان، امریکہ اور جاپان بھیجتی رہتی ہے۔ بدقسمتی سے اب تک من حیث القوم نہ ہمارے پاس کوئی اس قسم کی درس گاہ ہے اور نہ کوئی اس قسم کی انجمن ہے اور نہ اپنے نوجوانوں کو جن پر ہماری آئندہ اُمیدوں کا انحصار ہے، اس شعبہ کی طرف متوجہ ہونے کی کوشش کی ہے، جو آئندہ ہمارے اِن بیکار افراد کے لئے میدانِ جد وجہد کی صورت اختیار کرنے والا ہے جو سرکاری ملازمت کے دروازے اپنے لئے مسدود پائیں گے۔ میں اس امر سے ناواقف نہیں ہوں کہ بمبئی کے ممتاز لکھ پتی سر ابراہیم کریم بھائی کی شاہانہ فیاضی کے طفیل سے علیگڑھ میں ایک کالج کی بنیاد پڑ چکی ہے، جو پرنس آف ویلز سائنس کالج کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن جو رقوم جمع ہوئی ہیں وہ نہ صرف بہت قلیل ہیں بلکہ اس کالج کو عملی صنعت کے محکمہ کے درجہ تک پہونچانے کی غرض سے جس وسعت کی ضرورت ہے اس کے مقابلہ میں سراسر حقیر لگتی ہیں۔ اُس زمانہ میں جبکہ بقول ایک ممتاز مصنف کے (ترقی صنعت مصنفہ ایچ گھوش) اس ملک کے باشندے "قدرت کی فیاضیوں" کی بدولت صنعت وحرفت کے زیادہ محتاج نہ تھے اور زراعت ہی ان کے لئے ہر طرح سے کافی تھی، صورت حال آج سے مختلف تھی۔ لیکن جوں جوں آبادی بڑھتی گئی زمین کی زرخیزی میں فرق آتا گیا۔ آزاد تجارت کے اصول رائج ہو گئے۔ ہندوستان کے حالات میں ایک اہم بالشان تبدیلی واقع ہو گئی اور اب اس ملک کی اقتصادی تجارت اگر تمام تر نہیں تو ایک بڑی حد تک ضرور محض زمین کی پیداوار پر نہیں بلکہ صنعت وحرفت اور تجارت پر منحصر ہے۔

میں خیال کرتا ہوں کہ مغربی تعلیم کی طرح ہمارے ہندو بھائی صنعت وتجارت میں بھی ہم سے سبقت لے جا چکے ہیں۔ تیس سال کا عرصہ گزرا ہے کہ مسلمانانِ ہند بڑی یاس وناامیدی کی حالت میں نوحہ زنی کرتے تھے کہ ہم انگریزی تعلیم میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ میں

چالیس سال بعد ہمیں پھر یہ شکایت لاحق ہوگی کہ صنعت و حرفت اور تجارت کے زیادہ پُر امن شعبوں میں ہم دیگر اقوام کے مقابلے میں بالکل پس ماندہ ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمیں من حیث القوم سرکاری ملازمت کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لینا چاہئیں یا مختلف آزاد پیشوں کی طرف مثلاً قانون، طب اور انجنیری کی طرف مائل نہ ہونا چاہیے بلکہ ہم میں ایک کثیر تعداد کو چاہیئے کہ ان شعبوں میں داخل ہو، حقیقت حال یہ ہے کہ بمقابلہ دیگر اقوام کے سرکاری ملازمت میں ہمارا حصہ بالکل قلیل ہے۔ اور ہمیں اُمید ہے کہ مختلف سرکاری ملازمتوں کے متعلق ہمارے جائز حقوق پر ہماری تعداد کے لحاظ سے ضرور توجہ کی جائے گی۔ لیکن یہ یاد رکھیئے کہ کسی قوم کے تموّل کا اندازہ سرکاری ملازمت میں اس کی نیابت سے نہیں کیا جاسکتا انگلستان یا حقیقت میں یورپ کے کسی اور ملک کی دولت اور ثروت، اُن کے مصنوعات کی وسعت اور اُن کی تجارتی ترقی اور قابلیت پر منحصر ہے۔ اس کشمکش حیات میں جو ہمارے گرد جاری ہے میں اپنے نوجوانوں کو زیادہ آزاد اور سود مند پیشوں کی طرف متوجہ ہونے کی نصیحت کرتا ہوں۔ انھیں چاہیئے کہ اپنے تئیں تجارت اور صنعت و حرفت کے کاموں میں لگائیں اور ملک کے اُن ذخائر کی تلاش کریں جو مشترک سرمایہ اور باقاعدہ محنت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اُنھیں باہر جا کر بڑے بڑے کارخانوں اور عظیم الشان تجارتی دوکانوں میں کام سیکھنا چاہیئے اور پھر خود اپنا کاروبار جاری کرنا چاہیئے۔ میں جانتا ہوں کہ ہندوستان میں تجارتی کاروبار کے لئے کافی سرمایہ مہیا کرنا مشکل ہے۔ لیکن میں یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ ہم تھوڑی بہت شروعات ہی نہیں کر سکتے یا تجارت کے کاموں میں ہمیں بہت بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ اس قسم کے پیشے کچھ کم نہیں ہیں، جن کو ہم قلیل سرمایہ سے چلا سکتے ہیں اور اُن کے ذریعہ سے معقول آذوقہ حاصل کر سکتے ہیں بلکہ اگر میں یہ کہوں تو کچھ بیجا نہ ہوگا کہ کسی قوم کی صنعتی دولت کی تاریخ درحقیقت اس کے کاموں کی معمولی ابتدا کی تاریخ ہوتی ہے، اور قناعت استقلال اور محنت و مشقت کے اوصاف اُس کامیابی کے لئے کچھ کم ضروری اوصاف نہیں ہیں جو تموّل و دولت و ثروت کا باعث ہوتی ہے۔ سرزمین ہند میرے خیال میں ایسے وسائل اور ذرائع سے بھرپور ہے جن کی اب تک کسی کو خبر نہیں اور جن سے اب تک کسی نے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ بہت سی خام پیداواریں ہیں جو ممالک غیر کو جاتی ہیں اور جو وہاں سے اشیاء درآمد اور نفیس فیشن ایبل اشیائے تجارت کی شکل میں واپس آتی ہیں۔ جن کو ہم اصلی قیمت سے سوگنا زیادہ دام دے کر

خریدتے ہیں بے شبہ ایسی دستکاریاں بھی ہیں جو بغیر سرمایہ کثیر کے نہیں چلائی جاسکتیں مثلاً لوہا، کپڑا بُننے اور کاغذ بنانے کی کلیں، لیکن ایسی دستکاریوں کی تعداد بھی بے شمار ہے جن کی چلانے کے لئے سرمایہ کی اس قدر ضرورت نہیں ہے جس قدر محنت اور استقلال کی۔ افسوس ہے کہ شکّر سازی کی صنعت جو بالکل دیسی صنعت ہے اب بہ نسبت سابق روبہ تنزل ہے اور ظروف سازی کی قدیم صنعت بھی سرمایہ اور محنت کی کمی کی وجہ سے پژمردہ ہورہی ہے۔

سیوان اور کھلنا واقع بنگال۔ اعظم گڈھ۔ آگرہ۔ چنار۔ لکھنؤ اور میرٹھ واقع ممالک متحدہ داوہ سلیم مدورا واقع احاطۂ مدراس اور ہالا وبمبئی واقع احاطہ بمبئی کی منقش ظروف سازی کی صنعت آہستہ آہستہ معدوم ہورہی ہے۔ روغن دار ظروف سازی جو ایران کے قدیم ظروف کی نقل تھی اور جس کی نسبت سرجارج برڈوڈ کا قول ہے کہ افغان مغلوں کے ذریعہ سے ملک چین سے ایران میں تیمورلنگ کی چینی ملکہ کے اثر سے داخل ہوئی تھی وہ ایک زمانہ میں دہلی، پشاور، لاہور اور ملتان میں خوب رائج تھی اور یہ نامور مقبروں، قبروں اور محلّات کی صناعی کے کاموں کی خوبی کو بڑھانے اور دیرپا رکھنے کے کام میں لائی جاتی تھی۔ مگر اب یہ فن اپنی جاں کنی کی حالت میں ہے۔ اور امر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی آرٹس یا فنون کا خاصہ ہے کہ یا تو وہ ایک خاص حالت پر آکر رُک جاتی ہیں یا اُن میں تنزل پیدا ہوجاتا ہے اور وہ معدوم ہوجاتی ہیں۔ مثلاً قدیم زمانے کے رتھ کو لیجئے کہ کسی نے اس کی جائے نشست میں ترقی کرنے یا رفتار میں تیزی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ پس مغرب کی صنعت وحرفت کے نت نئے اصول اور نمونوں کی ترقیات کے مقابلے میں یہ صنعتیں قدرتی طور پر معدوم ہوتی جائیں گی۔ اب حالت یہ ہے کہ بجائے دہلی، لاہور اور ملتان کے روغن دار ظروف کے ریلوے اسٹیشنوں کے مسافرخانوں کے کمروں یا مشاہیر کے محلّات میں مغربی ممالک اور انگلستان کے ظروف نظر آتے ہیں۔ لیکن ظروف سازی کے لئے کسی بڑے سرمایہ کی ضرورت نہیں تھی۔ مصالحہ ارزاں اور بآسانی دستیاب ہوسکتا تھا اور کاریگر بھی بلاتکلف مہیا ہوسکتے تھے۔ ایک شخص جس میں عملی کام کرنے کا مادّہ ہو اور حرفت سے کسی قدر واقفیت اور انتظامی قابلیت ہو وہ اس صنعت کو سرسبز اور کاروبار کی حالت میں پہنچا سکتا ہے۔ ماسوا ازیں اس کے شیشہ سازی کی حرفت ہے جس کو زمانہ حال کے طریقے پر نہیں چلایا گیا۔ راجپوتانہ اور دیگر ریگستانی علاقہ جات میں بغیر کسی کثیر سرمایہ کے اس کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔ شیشہ سازی کی حرفت کے صرف دو کارخانے قابل ذکر ہیں ایک تو اپر انڈیا گلاس ورکس انبالہ میں

جس کی بنیاد ۱۹۰۳ء میں پڑی تھی اور دوسرا ممالک متحدہ میں بمقام تینی میں ہے۔ ایک کارخانہ کلکتہ میں بھی ہے لیکن اس کا مال ایسا اچھا نہیں کہ جس کی توقع ہو سکتی تھی۔ دوسرے مقامات میں بھی شیشہ سازی کی غیر منتظمانہ جدوجہد کی گئی مگر وہ یا حالت نزار میں ہیں یا بند ہو گئے ہیں اور اس طرح پرانے شیشہ گروں یا چوڑی گروں کو روٹی کمانا بھی دشوار ہو گیا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس قسم کے خانگی ضروریات کی اشیا جیسے بچوں کے آئینے۔ لیمپوں کی چمنیاں۔ فانوس اور شیشے کے گلاس، ان چیزوں تک کے لئے ہمیں بلجیم، آسٹریا اور جرمنی کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔ دروازوں کے پردوں کے لئے موتی اور پوتھ وینس اور واٹنا سے منگوانے پڑتے ہیں۔ میں نے ہندوستان کی پژمردہ صنعتوں کے متعلق آپ کی سمع خراشی صرف اس لئے نہیں کی کہ ہم ان کی طرف سے بے پرواہی کرتے ہیں بلکہ اس لئے کہ یہ کیسے ظلم کی بات ہے کہ ہم یہ یقین کرتے ہیں کہ ہندوستان کے دوکاندار پیدائشی دوکاندار ہوں۔ اور کمہار پیدائشی کمہار ہو۔

قصہ کوتاہ ہماری حالت یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے تجارتی کاروبار اور دوکانداری میں پہلے ہی سے ہم ہندو دوستوں سے پیچھے رہ گئے ہیں اور سرمایہ مشترکہ کی کمپنیوں کے مقابلے میں بھی ہم میں اور ابنائے وطن میں اس سے کچھ کم تعدد فصل نہیں ہے۔ میں یقین نہیں کرتا کہ یہ بات محض ہمارے افلاس اور تنگدستی کے سبب سے ہے۔ بے شک ہم غریب ہیں اور غریب اس لئے ہیں کہ بمقابلہ اپنے متحمل اور سرسبز اور کفایت شعار ہندو بھائیوں کے ہم غیر مآل اندیش اور مسرف ہیں۔ تجارتی معاملات میں ہمارے مقابلتہً پیچھے رہ جانے کے اور بھی وجوہات ہیں۔ اول تو یہ ہے کہ ہم باقاعدہ کاروبار کے طور طریق سے ناآشنا ہیں۔ دوسرے ہم کو یہ ایک مہمل شک رہتا ہے کہ شاید اس کام کے کرنے میں فائدہ ہو یا نہ ہو اس لئے ہمارے صاحب جائداد اور متمول لوگ بہت سے ایسے ہیں جو تجارتی کاروبار میں ہاتھ ڈالتے جھجکتے ہیں۔ بہت سے ہندو والیان ریاست، مالکان اراضی اور زمیندار تجارتی کمپنیوں میں ہمیشہ حصہ لیتے رہتے ہیں جیسا کہ ہز ہائینس راجہ صاحب ناہن راجہ بہادر لالہ رام سرن داس صاحب اور ایسے ہی بہت سے دیگر اصحاب ہیں لیکن کوئی نواب یا کوئی اور بڑے مسلمان صاحب اراضی کسی تجارتی کمپنی میں شرکت کرنا اپنی شان کے خلاف تصور کرے گا انگلستان اور دیگر ممالک مغربیہ میں لارڈز اور دوسرے بڑے بڑے آدمی تجارتی کاروبار میں نمایاں حصہ لیتے ہیں لیکن من حیث القوم ہماری سمجھ ہی میں یہ بات نہیں آتی ہے کہ طبقہ متوسطہ کے تعلیم یافتہ اور کاروباری لوگوں کے ساتھ

ارباب دولت کے کام کرنے سے ایک قسم کی ساکھ قائم ہوتی ہے۔ جس کے بغیر بہت ہی تھوڑے تجارتی کاروبار ہوں گے جو شروع کئے گئے ہوں۔

حضرات! ہندوستان میں تعلیم عامہ کے ہم پلہ تعلیم نسواں کا مسئلہ بھی ہے آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ یہ ایک بڑا نازک مسئلہ ہے کیونکہ اس کا اثر ہندو اور مسلمان دونوں کی عزیز مقدس رسوم پر پڑتا ہے یا پڑنے کا احتمال ہے۔ اختلاف آرا صرف اس سوال کے متعلق نہیں ہے بلکہ اس سوال کے متعلق بھی ہے کہ عورتوں کے درس کے لئے کس قسم کی کتابیں ہونا چاہئیں جو اُن کے اور جماعت نسواں دونوں کے حق میں سود مند ہوں۔ پس اس سوال کے دو شق ہیں۔ (۱) یہ کہ طریق تعلیم کیا ہو؟ - (۲) نصاب تعلیم کیا ہو جو عورات کے لئے سود مند ہو؟ طریق تعلیم کے متعلق آزادی پسند جماعت کی تو یہ رائے ہے کہ جب تک پردہ کا رواج قائم رہے گا عورتیں تعلیم نہیں پا سکیں گی اور پا سکیں گی تو وہ تعلیم کافی نہ ہوگی۔ قدامت پسند یا وہ لوگ جو زیادہ صحیح طور پر کنسرویٹو کہے جاسکتے ہیں اس کے بالکل مخالف ہیں کیونکہ اس سے پردہ کی جس کو وہ دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں بے حرمتی ہوتی ہے۔ وہ اس امر کو نہایت تباہ کن سمجھتے ہیں کہ آزادی پسند جماعت کا یہ خیال ہو کر زنانہ اسکول کی چار دیواری میں گویا اصلاح کی عیب کا گولا پھینکا جائے تجربہ اور (بہترین استاد) زمانہ شاید بتلائے کہ ہم اپنے جسم کے بہترین حصے کو (عورات کو) کس طریق سے بہترین تعلیم دے سکتے ہیں۔ لہذا میں نہیں چاہتا کہ اس امر کے متعلق اپنے خیالات کے اظہار سے میں آپ کی سمع خراشی کروں مگر صاحبان۔ ایک بات کا تو مجھے یقین واثق ہے کہ ہمارا مذہب صاف طور پر تعلیم نسواں کا مدد و معاون ہے طلب العلم فریضۃٌ علیٰ کل مُسلم و مُسلمۃ۔ میں باور کرتا ہوں کہ اس امر میں کوئی اختلاف رائے نہیں ہے کہ عورتوں کو بھی مردوں کے پہلو بہ پہلو تعلیم دی جانی چاہیے۔

گھر جہاں بچے پرورش اور تربیت پاکر مرد اور عورت بنتے ہیں اُس طاقت کے لحاظ سے اچھے یا برے ہوتے ہیں جو وہاں حکمراں ہوتی ہے اور جو طاقت گھروں پر حکمرانی کرتی ہے وہ ماں ہوتی ہے۔ سب سے پہلا اور بڑا معلم مثال ہوتی ہے اور یہ مثال ماں ہی کی ہوتی ہے جو ہمیشہ بچوں کے پیش نظر ہوا کرتی ہے اور اُن کی زندگی پر اس کا ہی اثر پڑا کرتا ہے۔ بچپن کے زمانہ میں جو بہت اثر پذیر اور تقلید کا زمانہ ہوتا ہے یہ ماں ہی کا سانچہ ہے جس میں نوزائیدہ بچہ ڈھلتا رہتا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ میرا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ رنج یا راحت، روشن دماغی یا جہالت مزاج اور طبیعت اور عادات کے پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہونے کا انحصار جن کے ساتھ ساتھ پرورش پاتا ہے ایک بڑی حد تک اُن اختیارات کے استعمال پر ہوتا ہے جو عورت کو گھر کی خاص اور شاہانہ میں

حاصل ہوتے ہیں عورتیں ہمارے نیک و بد اور رنج و راحت کی شریک حال ہوا کرتی ہیں جب صورت حال یہ ہے تو ہم پر مذہبًا اخلاقًا اور مجلسی قواعد کی رو سے واجب اور لازم ہے کہ ہم ان کو تعلیم دیں اور اس قابل بنائیں کہ زندگی میں وہ ہمارے لئے ایک رفیق اور ہمدم ثابت ہوں اب سوال یہ ہے کہ وہ تعلیم کونسی ہے جو دی جائے۔ حضرات! اگرچہ میں اس امر میں مخالفین تعلیم نسواں کے ہم رائے نہیں ہوں کہ عورتوں کو جغرافیہ کی اتنی تعلیم ہو کہ وہ گھر کے مختلف کمروں کو جان لیں کیمسٹری کی اسقدر کہ پانی کا ابلنا جانیں اور تاریخ کی اسقدر کہ اپنے والدین کے مختلف رشتہ داروں کو معلوم کرلیں تاہم برخلاف اس کے میں اس تعلیم کا بھی سخت مخالف ہوں جو عورت کو اس کے دائرہ سے نکال دے یا اس کو گھر کی چار دیواری کو اس سے چھڑا دے! اپنی لڑکیوں کی تعلیم کے اسکیم میں میں مذہبی تعلیم اور کامل مذہبی تعلیم کو سب سے اول جگہ دونگا! اس کے بعد سینا پرونا سوزن کاری اور خانہ داری کی تھوڑی تعلیم حفظان صحت کا علم ان کے علاوہ انگریزی سے بھی تھوڑی بہت واقفیت ہوتا کہ دوائی شیشیوں کے لیبل اور دوسری ضروریات خانہ داری کی چیزوں کے ناموں کی شناخت ہو سکے۔

حضرات! اس بارے میں آپکے کچھ ہی خیالات کیوں نہ ہوں کہ ہماری مستورات کو کس طریق پر تعلیم دی جائے اور میں جانتا ہوں کہ ابھی اس پر سب کا اتفاق رائے بھی نہیں ہوا ہے لیکن ایک بات کا مجھے یقین ہے وہ یہ کہ اگر آپ تعلیم نسواں کی مخالفت بھی کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے! اصولاً بھی ہم کو یہ تعلیم دلانا چاہیئے اور اس کی طلب اور ہم رسانی کے اعتبار سے ہم پر لازم ہے کہ ہم تعلیم دلائیں۔ زمانہ اس کی تائید میں ہے اور جس طرح ہم آبشار نگاکو روک نہیں سکتے اسی طرح ہم اُن کی تعلیم کی بھی مزاحمت نہیں کر سکتے۔ ٹرکی اور مصر میں پہلے ہی سے تعلیم نسواں کی بابت ایک فیصل شدہ تحریک موجود ہے۔ ہندوستان میں بھی دیگر اقوام اس خصوص میں سرگرمی دکھلا رہی ہیں بنگال میں ہندوؤں نے اور حیدر آباد میں مسلمانوں نے اس میں بڑی ترقی کی ہے۔ بمبئی اور مدراس میں نوجوان لڑکیوں کی تعلیم کا خوب بندوبست ہو گیا ہے اور بھوپال میں علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال کی فیاضی کی بدولت ایک بہت عمدہ درس گاہ نوجوان خواتین کے لئے جاری کی گئی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ مستورات کو تعلیم یافتہ بنانے کی مخالفت ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر ہم اس کی تعلیم کے نصاب میں مذہبی تعلیم کو سب سے اول جگہ دیں تو یہ مخالفت جاتی رہے گی۔

حضرات! ایک بات مجھے سب سے زیادہ کھٹکتی ہے اور جس پر اس قدر غور نہیں کیا گیا جس قدر کی وہ مستحق ہے۔ ہم اس امر کو تسلیم کرتے ہیں کہ بہت سے ایسے طالب علم ہوتے ہیں جو میٹرکولیشن کا امتحان پاس کر لینے کے بعد بوجہ نہ ہونے کافی ذرائع کے تعلیم آگے جاری نہیں رکھ سکتے۔ ہم نے اپنی قوم کے اُن نادار غیر مستطیع طلبا کی امداد کے لئے ابتک کچھ نہیں کیا۔ بسلسلہ اون کی بڑی ضرورت ہے کہ چند وظائف کا اہتمام کیا جائے جن سے غریب اور مستحق طلباء کو مدد مل سکے۔ یہ ضرورت نہیں ہے کہ سارا ہندوستان مل کر ایسے وظائف مقرر کرے اور اگر ایسا ممکن ہو تو مجھے کوئی وجہ مخالفت نہیں ہوگی۔ میں خیال کرتا ہوں کہ عملی طور سے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ ہر ایک صوبہ یا ضلع میں اس مطلب کے لئے علیحدہ علیحدہ فنڈ ہوں۔ کام کرنے والوں کی ایک شریف جماعت

۔ جس کا نام انجمن ترقی تعلیم امرتسر ہے اس بارہ میں نہایت عمدہ تحریک جاری کی ہے اور مجھے امید ہے کہ دوسرے اضلاع
میں بھی اس کی تقلید کی جائے گی اور جہاں جہاں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا اس جگہ ایک
ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل فنڈ کے قائم کرنے کے متعلق وصولی چندہ کے لئے ایک کارکن کمیٹی کے قائم کرنے میں دریغ نہ ہوگا۔
اگر ہم ایسا کر سکیں تو مجھے یقین ہے کہ اپنی قوم کے تعلیمی درجہ کو دیگر اقوام کے پہلو بہ پہلو کرنے کے اہم مسئلہ میں ہم کامیاب ہو سکیں گے
ایک اور معاملہ بھی ہے جس کی اسی طرح کم توجہ کی گئی ہے۔ یعنی علوم قدیمہ کی استواری جس کا حوالہ نمایاں طور سے حضور ملک
معظم نے کلکتہ یونیورسٹی کے ایڈریس کے جواب میں دیا تھا۔ یہ ایک ایسا مقصد ہے جس کے ترقی دینے میں بحیثیت ایک قوم
ہم نے یا تو بہت کم جد و جہد کی ہے یا مطلق کچھ بھی نہیں کیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری یونیورسٹی کے اغراض و مقاصد میں اس کو
بھی شامل ہونا چاہئے۔ لیکن کسی ملک میں بھی حتی کہ ان ممالک میں جہاں یونیورسٹیاں بکثرت ہیں قدیم علوم کی اشاعت
کرنے کا کام یا السنہ قدیم اور قدیم فلسفہ اور تاریخ کو ترقی دینے کا کام محض یونیورسٹیوں پر بلا امداد و معاونت نہیں چھوڑا
گیا۔ سوسائٹیاں، تعلیم گاہیں، مدارس اور انجمنیں جس کے کام میں امداد اور تقویت دیتی ہیں۔ لیکن اس میں مجھے شبہ
ہے کہ ہمارے یہاں بھی کوئی ایسی سوسائٹی ہے یا اس کے پاس اس کام کے لئے سرمایہ ہے کہ متلاشیان علوم کے لئے ترجمہ
اور اخذ مطالب سے وہ خزانہ علوم بہم پہنچائے جو عربی یا فارسی السنہ میں یا نایاب قلمی نسخہ جات میں بھرے پڑے ہیں۔ میں
سمجھتا ہوں کہ اگر ہم کوئی ایسی انجمن قائم کرنے کی سرگرمی کے ساتھ سعی کریں جو السنہ مشرقیہ کے تراجم و اشاعت کا
کام کرے تو ہماری یہ کوشش حق بجانب ہوگی۔ پنجاب میں سردار سندر سنگھ مجیٹھیہ کی سعی و کوشش سے اس قسم کی ایک
تحریک کی بنیاد پڑ گئی ہے۔ بنگال میں ہندوؤں کی ایک سبھا ساہتیہ پریشاد نام کی قائم ہے۔ بمبئی میں بھی اس قسم کی
انجمن ہے جس کی کامیابی راناڈے اور تلنگ جیسے اصحاب کے طفیل میں ہوئی ہے۔ الہ آباد میں نہایت مفید کام
پانینی کے دفتر میں تراجم اور طبع کے ذریعہ سے ہو رہا ہے، لیکن ہمارے یہاں اس قسم کی کوئی انجمن نہیں ہے۔

اے حضرات کانفرنس! میں نے آپ کا بہت سا وقت لیا جس کے لئے میں خواستگار معافی ہوں اور آپ کا شکریہ ادا
کرتا ہوں کہ آپ نے صبر اور توجہ سے میری تقریر کو سنا جس کو میں صرف ایک بات اور کہہ کر ختم کرتا ہوں۔ آپ کا مقصد
درحقیقت نہایت اعلیٰ اور شریفانہ مقصد ہے۔ میری مراد اس مقصد سے ہے جو آپ اپنے ہم مذہبوں کی تعلیم کے لئے
سرانجام دے رہے ہیں۔ تعلیم مثل خیرات کے ہے اس کو برکت دیتی ہے جو اسے لیتا ہے یا دیتا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کے یہ
ایک ایسا مقصد ہے جس کے لئے ایثار، استقلال اور اس قوت ارادی کی ضرورت ہے جو ہم اس کے لئے
صرف کر سکیں، اور اس لئے میں دست بدعا ہوں کہ آپ کو ان مقاصد میں جو آپ کے پیش نظر ہیں اعلیٰ طور پر
کامیابی حاصل ہو۔

اجلاس منعقدہ راولپنڈی میں منظور ہونے والی قراردادیں

اس اجلاس میں مندرجہ ذیل امور پر خاص طور پر بحث ہوئی اور یہ تجاویز منظور کی گئیں۔

۱۔ مدراس میں مسلمانوں کی تعلیم کے لیے اسکولوں کا قیام۔

۲۔ کلکتہ کے مدرسہ کو اسلامی کالج بنائے جانے کی تحریک۔

۳۔ کلکتہ یونی ورسٹی کے اس فیصلہ سے اختلاف کیا گیا کہ وہاں ایم-اے-کلاسوں سے عربی اور فارسی کو ترک کر دیا جائے۔

۴۔ راولپنڈی ڈویژن کے مسلمانوں کی درخواست برائے وصول یابی چندہ (۳ پیسہ فی روپیہ) کی منظوری۔

("آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سوسال" از امان اللہ خاں شیروانی، ص ۸۲، ۸۳)

آل اِنڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال

امان اللہ خاں شیروانی

سابق پرنسپل
اسلامیہ کالج، اٹاوہ
آنریری جوائنٹ سکریٹری
آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

آل اِنڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس
سُلطان جہاں منزل ☆ علی گڑھ۔۲۰۲۰۰۲

عکس سرورق: ”آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال“ مرتبہ امان اللہ خاں شیروانی، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۹۴ء

دستاویزات کانفرنس سلسلہ ۲

رپورٹ

متعلق اجلاس بست وہشتم

آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس

بمقام راولپنڈی

منعقدہ ۲۷، ۲۸، ۲۹ دسمبر ۱۹۱۴ء

جو حسب ہدایت نواب حاجی محمد اسحٰق خاں صاحب آنریری سکرٹری

زیر نگرانی آفتاب احمد آنریری جائنٹ سکرٹری مرتب کی گئی

باہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی

انسٹیٹیوٹ پریس علی گڑھ میں طبع ہوئی

(اور صدر دفتر کانفرنس سے شائع ہوئی)

عکس سرورق: رپورٹ متعلق اٹھائیسواں سالانہ اجلاس ۱۹۱۴ء۔ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ راولپنڈی، طبع علی گڑھ ۱۹۱۸ء

کچھ مخلص احباب اس فقیر کو "جنونی" کہتے ہیں۔ صاحب جنوں ہونا اپنی جگہ بہت بڑی بات ہے جس کا میں خود کو اہل نہیں پاتا۔ اس میں کلام نہیں کہ جب سے حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کا دامن تھاما ہے، تحقیق و جستجو کے صحرا کی خاک چھانتا پھرتا ہوں۔ یوں سیلانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ مقامی طور پر مواقع کچھ زیادہ نہیں پاتا، تو اکثر کراچی نکل جاتا ہوں۔ قائد ملت اسلامیہ حضرت علامہ شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۱ دسمبر ۲۰۰۳) کے عُرس پر حاضری یقینی ہوتی ہے۔ اس بہانے کراچی کا قیام طویل ہو جاتا ہے جس میں مقتدر علمی شخصیات سے بالمشافہ شرف استفادہ کے ساتھ ساتھ لائبریریوں میں محفوظ نوادرات سے خوشہ چینی کی نعمت غیر مترقبہ میسر آتی ہے۔

اب کے جانا ہوا تو اکادمی آف ایجوکیشنل ریسرچ (ادارہ تصنیف و تالیف) کراچی کی مطبوعہ رپورٹ متعلق اجلاس بست و ہشتم آل انڈیا محمدن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس بمقام راولپنڈی منعقدہ ۲۷، ۲۸، ۲۹ دسمبر ۱۹۱۴ء (مطبوعہ بار دوم ۲۰۰۲ء) دستیاب ہوئی۔ ۴۳۱ صفحات پر پھیلی یہ مستند رپورٹ بے حد قیمتی دستاویز ہے۔ کانفرنس کا بڑا مقصد متحدہ ہندوستان کے تمام صوبجات میں انگریزی اور جدید تعلیم کے ادارے قائم کرنے کے ساتھ معیاری اسلامی تعلیم گاہوں کا قیام بھی تھا۔ اس کانفرنس میں (۳۱) رزولیوشن باتفاق آراء پاس ہوئے (رپورٹ صفحہ ۳)۔ اس رپورٹ میں سرحد اور پنجاب کے ہی نہیں ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے تعلیمی احوال اور ضروریات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

پیش نظر رپورٹ کے مطالعہ سے ایجوکیشنل کانفرنس کے ہمہ گیر اثرات کا پتا چلتا ہے۔ قارئین کرام کے لیے یقیناً آج یہ بات اچنبھے کی ہوگی کہ راولپنڈی اسٹیشن پر دوسرے ہم وطن افراد

(اہل ہنود وسکھ) کی بڑی تعداد موجود تھی جنھوں نے صاحب صدر اجلاس اور تمام مہمانوں کا گرم جوشی سے استقبال کیا، پھول برسائے۔ شہر میں جا بجا ان کی طرف سے آرائشی دروازے بنائے گئے تھے۔ اور مہمانان گرامی کی پان، مصری، الائچی وغیرہ سے تواضع کی اور وہ کانفرنس کے تمام اجلاسوں میں برابر شریک رہے۔ صدر مجلس نے سکھ و ہندو صاحبان راولپنڈی کا خصوصی طور پر شکریہ ادا کیا اور دعا کی کہ خدائے تعالیٰ تمام باشندگان ملک کو اسی قسم کی یک جہتی اور باہم ہمدردی کی توفیق عنایت کرے جس کے جواب میں بابا اوجاگر سنگھ صاحب بیدیؔ، آنریری مجسٹریٹ وسول جج راولپنڈی نے حسب ذیل کلمات بطور اظہار تشکر ادا کیے۔

"فخر وطن پریزیڈنٹ صاحب و حاضرین جلسہ۔

مَیں مولوی صاحب سی۔ آئی۔ ای (خان بہادر سر رحیم بخش صاحب) کے اُن سنہری الفاظ کا (جو کہ آپ نے اہل ہنود شہر راولپنڈی کے بارہ میں ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمائے ہیں) تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اے صاحبان آپ کی خدمت میں یہ ظاہر کر دینا ایک نئی بات نہیں ہے کہ ہمارے مذہب کے بزرگ "بانی" شری گورونانک دیو جی مہاراج کی پوتر ہدایت جو کہ انھوں نے ایک مرتبہ اپنی پرتھہ یاترا کرتے ہوئے ایک قابل عزت قاضی صاحب سے تذکرہ ہونے پر فرمائی جبکہ قاضی صاحب کا یہ سوال تھا کہ اے بابا نانک! کہیے۔ ہندو اچھے ہیں یا کہ مسلمان۔ اس وقت آپ نے اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمایا کہ

اول اللہ نور اُپایا، قدرت کے سب بندے

ایک نور نے سب جگ اُپجیا کون بھلے کون مندے

صاحبان آپ کو بخوبی روشن ہو گیا ہوگا کہ اہل ہنود سکھ قوم کے واسطے اسی پوتر اُپدیش پر چلتے ہوئے یہ ایک عجیب بات نہیں ہے کہ وہ اپنے وطن کے رکن اور اپنی ہمسایہ قوم کے لیڈر کو جو کہ ان کے شہر میں تعلیم کی ترقی کے نیک کام کو مدنظر رکھ کر

تشریف لاتے ہیں ان کا خیر مقدم کہنے کے واسطے کیوں اسٹیشن پر حاضر نہ ہوتے ۔۔۔"

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایجوکیشنل کانفرنس کے قائدین کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ وہ اپنے اجلاس میں اختلافی امور اور ایسی تقاریر سے اجتناب کریں جن سے ملی یک جہتی کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہو، تاہم ان موضوعات کو شرعی اور سیاسی بحث کے لیے دوسرے موقعوں پر اٹھا رکھا جاتا (رپورٹ ص ۱۹۰)۔

چوں کہ کوئی بھی قومی ادارہ یا کوئی بھی انجمن یا تنظیم روپئے پیسے کے بغیر نہیں چل پاتی اس لیے کانفرنس کی جانب سے نہ صرف رؤسا، مخیّر اور فیاض اصحاب سے اپیل کی جاتی بل کہ علما اور مشائخ کی توجہ ان قومی تعلیم گاہوں کی طرف مبذول کروائی جاتی کہ وہ بھی اس کام میں ہاتھ بٹائیں۔ رپورٹ کے صفحہ ۱۶۱ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خان، آنریری جائنٹ سیکریٹری آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس فرماتے ہیں۔

ہم کو اپنی قوم کے مشائخ اور علما سے مدد لینا چاہیے کہ اس امر کا علی الاعلان فتویٰ دیں کہ اس ملک کے اسلامی بالغ کے افراد کے دلوں دماغوں کو علم اور تربیت کے چشموں سے سیراب کرنا بہترین ذریعہ مغفرت اور حصول ثواب کا ہے نیز ہماری کانفرنسوں اور لوکل کمیٹیوں کو چاہیے کہ اپنے اپنے حدود میں قوم کی موجودہ پستی اور اُس کے اسباب اور علاج کو افرادِ قوم کے ذہن نشین کریں یہ کانفرنس سالہا سال سے اس خدمت کو انجام دے رہی ہے لیکن ایک آواز اس قدر بڑے ملک اور قوم میں سب جگہ اور سب کے پاس کیسے پہنچ سکتی ہے؟ ہر جمعہ کو مساجد کے وعظوں میں ہر سال عیدین کے خطبوں میں، اجمیر شریف اور دیگر متبرک مقامات کے عرسوں میں غرض کہ ہر جگہ اور موقع پر جہاں مسلمان خود اپنے عقائد کی بدولت جمع ہوتے ہیں وہاں انھیں خیالات اور حالات کی اشاعت ہو۔

صاحبزادہ صاحب کی مندرجہ بالا اپیل کے تناظر میں اگر علامہ شبیر احمد خاں غوری کے

مضمون کا مطالعہ کرلیا جائے تو دلچسپی اور معلومات کا موجب ہوگا کہ مولانا سلیمان اشرف محولہ رپورٹ سے بہت پہلے اسی راہ پر گامزن نظر آتے ہیں۔ بے غرضی اور فروغ علم کے مشن کے لیے تن دہی کا جذبۂ خیر مولانا ہی کا حصہ ہے۔ غوری صاحب مرحوم رقم طراز ہیں۔

مسلم یونی ورسٹی میں اپنے فرائض منصبی کے دوران مولانا کے دینی و علمی معمولات میں سب سے اہم مصروفیت ہر سال عرس کے موقع پر حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ پر حاضری اور وہاں میلاد خوانی تھی، مگر حضرت مولانا کی دینی غیرت کہ یونی ورسٹی سے مصارفِ سفر نہیں لیتے تھے اور نہ متولیٔ درگاہ سے یہ الگ بات کہ اس میلاد کے ذریعہ یونی ورسٹی کی کارکردگی اور پبلسٹی کے علاوہ اہل خیر کی جانب سے رقم کثیر یونی ورسٹی کے چندہ کے لیے دی جاتی تھی۔

مطبوعہ رپورٹ سے کچھ صفحات کے عکس بطور ضمیمہ کتاب کے آخر میں شامل کرتے ہوئے ہم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اس عہد ساز کردار کو ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں کہ ”ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے اور انھیں جدید علم وفن سے واقف کرانے میں کانفرنس نے زبردست رول ادا کیا، آج کی نئی نسل اس عظیم تعلیمی، اصلاحی اور ثقافتی ادارے کے کارناموں سے قطعاً ناواقف ہے“۔ اور بقول امان اللہ خاں شیروانی، ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مسلم نشاۃ الثانیہ کی تحریک میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سب سے زیادہ حصہ رہا ہے۔ دراصل کانفرنس ہی علی گڑھ تحریک ہے۔ یقیناً کانفرنس نے تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کے سلسلہ میں مسلمانوں میں بیداری پیدا کی۔ اس عہد آفریں کانفرنس کی اہمیت اور قدر و قیمت اس کے شرکائے محترم کی عظیم شخصیات کے محض نام لینے سے اظہر من الشمس ہے۔ ذرا غور تو کیجیے کہ کون کون نابغہ اس محفل کو رونق بخش رہا تھا۔ یہ ہیں مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، صاحبزادہ سر عبدالقیوم بانی اسلامیہ کالج پشاور، مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی، بابائے اردو مولوی عبدالحق، خواجہ کمال الدین۔
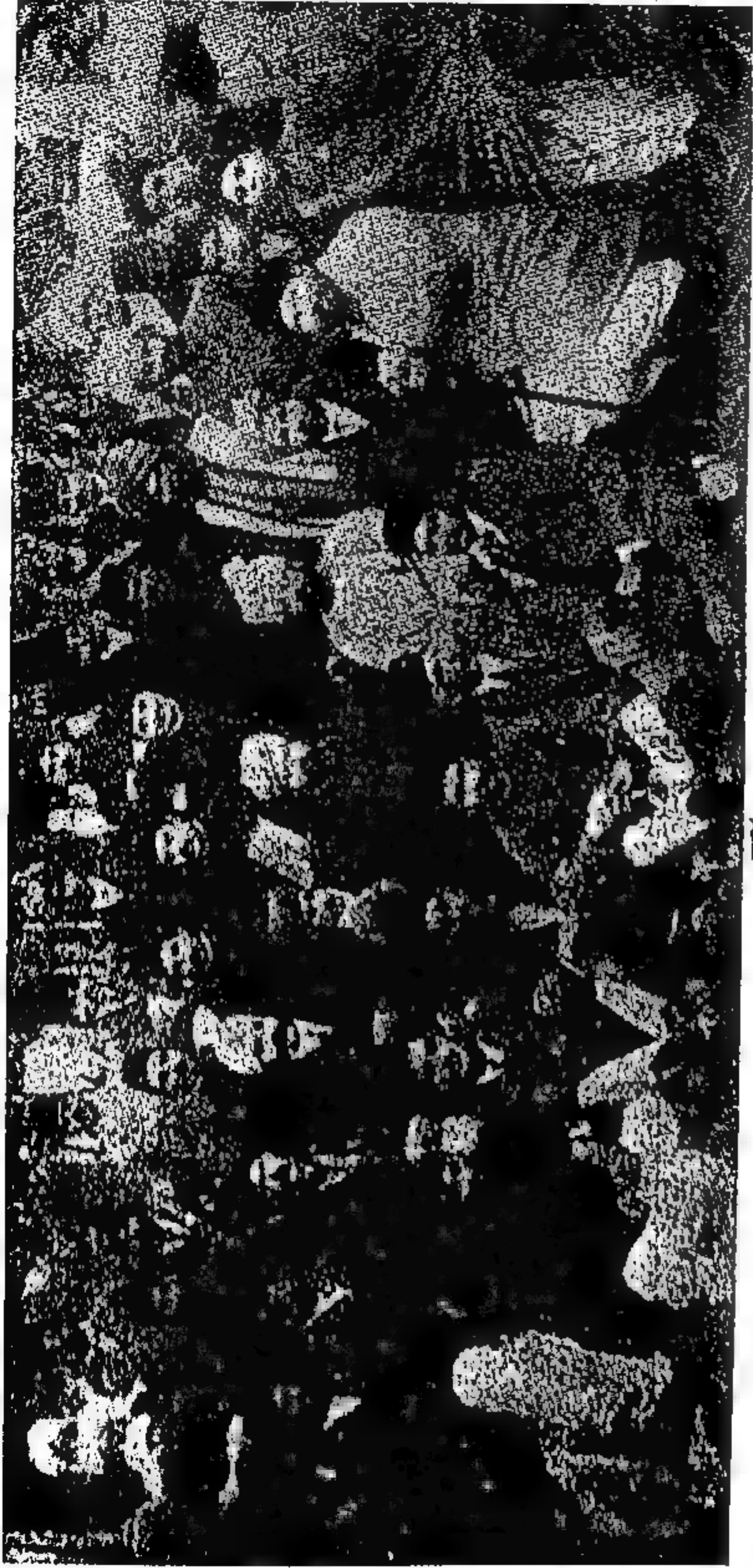
مولانا محمد علی جوہرؒ

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس راولپنڈی ۱۹۱۴ء میں دیگر مندوبین کے ساتھ (بائیں سے دائیں کرسیوں پر): ۵ صاحبزادہ سر عبدالقیوم بانی اسلامیہ کالج پشاور ۶ مولانا ابوالکلام آزاد ۷ خواجہ کمال الدین ۸ مولانا محمد علی جوہر رحمتہ اللہ علیہ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کارروائی اجلاس بست و ہشتم

آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس

منعقدہ بمقام راولپنڈی (پنجاب)

اجلاسِ اوّل

منعقدہ بتاریخ ۲۷ دسمبر ۱۹۱۴ء یوم یک شنبہ بوقت ۱۰ بجے دن سے ایک بجے دن تک

پریزیڈنٹ

عالی جناب خان بہادر مولوی حاجی رحیم بخش صاحب سی۔ آئی۔ ای۔ پریسیڈنٹ

کونسل آف ریجنسی ریاست بہاولپور

اجلاس کا وقت سابقاً آٹھ بجے تجویز ہوا تھا۔ مگر راولپنڈی کی سردی کا خیال کر کے وقت بدل دیا گیا اور دس بجے دن کا وقت مقرر کیا گیا۔ وقت مقررہ کے قبل ہی تمام وسیع پنڈال ممبران و وزیٹران سے

رپورٹ متعلق اجلاس بست و ہشتم آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا صفحہ ۴۱ بمقام راولپنڈی ۱۹۱۴ء

پر ہو گیا تھا۔ ساڑھے تین سو سے زائد ممبر تقریباً پانسو وزیٹر اور ڈیڑھ سو کے قریب آنریری وزیٹر شریک اجلاس تھے باوجود سفر دور دراز و سخت سردی کے اکثر معززین و اکابرین قوم اس اجلاس میں تشریف فرما تھے یورپین اصحاب میں سے کرنل یوہیم بنیگ کمشنر راولپنڈی۔ سر میرلڈ گٹسن کمانڈنگ آفیسر بریگیڈ راولپنڈی ڈویژن، صاحب ڈپٹی کمشنر راولپنڈی، مسٹر ایل ٹنگ صاحب ایم اے پرنسپل اسلامیہ کالج پشاور، صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس۔ پرنسپل صاحب مشن کالج نے اپنی شرکت سے اجلاس کو رونق بخشی۔ ماسوائے یورپین حضرات کے اکثر برادران اہلِ ہنود و سکھ سر اجلاس میں برابر شریک ہو کر کارروائی ملاحظہ کرتے تھے۔

ساڑھے دس بجے عالی جناب خان بہادر مولوی حاجی رحیم بخش صاحب سی۔آئی۔ای پنڈال میں رونق افروز ہوئے۔ حاضرین نے تعظیماً سروقد ایستادہ ہو کر پرجوش نعرہ ہائے مسرت و چیئرز کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ ڈائس پر ممبران ریسپشن کمیٹی اور دیگر معزز اصحاب تشریف رکھتے تھے جن میں سے چند بزرگوں کے اسمائے گرامی ذیل میں درج ہیں:۔

۱۔ عالی جناب نواب کپتان ملک محمد مبارز خاں صاحب ٹوانہ رئیس شاہ پور
۲۔ عالی جناب آنریبل محمد امین صاحب رئیس ضلع کیمبل پور
۳۔ عالی جناب صاحبزادہ عبدالقیوم خاں صاحب سی۔آئی۔ای
۴۔ عالی جناب جنرل عبدالرحمٰن خاں صاحب بہاول پور
۵۔ عالی جناب مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی رئیس علی گڑھ
۶۔ عالی جناب آنریبل سید رضا علی صاحب وکیل، مراد آباد
۷۔ عالی جناب مسٹر محمد علی صاحب بی۔اے (آکسن)
۸۔ عالی جناب مسٹر شوکت علی صاحب بی اے
۹۔ عالی جناب مولوی ابوالکلام صاحب آزاد دہلوی
۱۰۔ عالی جناب مولوی عبیداللہ صاحب ناظم نظارت المعارف القرانیہ دہلی
۱۱۔ عالی جناب مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے سکرٹری انجمن ترقی اردو
۱۲۔ عالی جناب مسٹر ایل ٹنگ صاحب پرنسپل اسلامیہ کالج پشاور
۱۳۔ عالی جناب مولوی بشیر الدین صاحب ایڈیٹر اخبار البشیر اٹاوہ

۱۴- عالی جناب میر نثار حسین صاحب ڈپٹی مجسٹریٹ علی گڑھ۔

۱۵- عالی جناب مولوی سلیمان اشرف صاحب پروفیسر دینیات مدرسۃ العلوم علی گڑھ

۱۶- عالی جناب مولوی الف دین صاحب پلیڈر کیمبل پور

۱۷- عالی جناب مولوی نثار علی صاحب انسپکٹر مدارس لاہور سرکل

آغازِ کارروائی

دس بجکر ۴۰ منٹ پر جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ سب سے اول مولوی سلیمان اشرف صاحب پروفیسر دینیات مدرسۃ العلوم علی گڑھ نے تیمناً و تبرکاً قرآنِ کریم کی چند آیات خوش الحانی کے ساتھ تلاوت فرمائیں۔ دورانِ تلاوت میں جملہ حاضرین تعظیماً استادہ رہے۔ اس کے بعد جناب ڈاکٹر کپتان ملک محمد مبارز خاں صاحب ٹوانہ رئیس شاہ پور نے بحیثیت پریسیڈنٹ استقبالی کمیٹی اپنا مطبوعہ ایڈریس پڑھا جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے :-

ایڈریس پریزیڈنٹ صاحب ریسپشن کمیٹی آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس راولپنڈی

حضرات اب سے پہلے مجھے استقبالیہ کمیٹی کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے کہ کمال مہربانی سے مجھے کمیٹی کا پریزیڈنٹ منتخب کیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی مجھے اپنے اِن مکرم و معزز احباب کا جو استقبالیہ کمیٹی کے ممبر ہیں آپ حضرات کے سامنے شکوہ بھی کرنا ہے کہ انھوں نے میرے انکار پر جو میں نے اس جلیل القدر منصب کے قبول کرنے سے بار بار اُن کے سامنے پیش کیا مطلق التفات نہ کی اور مسلسل طور پر اصرار کرنے سے مجھے اس خدمت کو اپنے ذمہ لینے پر مجبور کیا۔ بلاشبہ یہ امر میرے لئے نہایت فخر اور شکرگذاری کا موجب ہے اور میں سچے دل سے اس عزت کی قدر کرتا ہوں۔ میرا انکار اس بنا پر نہیں تھا کہ ایک قومی خدمت کے ادا کرنے میں مجھے تامل تھا۔ میرے انکار کی اصلی وجہ یہ تھی کہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی اس عظیم الشان قومی تعلیمی مجلس کی استقبالیہ کمیٹی کا پریزیڈنٹ ہونے کا اپنی علمی بے بضاعتی کی وجہ سے میں اپنے آپ کو اہل

نہیں سمجھتا تھا اور اب جب میں اپنے آپ کو اپنی قوم کے تعلیم یافتہ اصحاب نے علما کی اس محترم مجلس کے سامنے کھڑا ہوا دیکھتا ہوں۔ تو اپنی حالت کو اس قطرہ باراں کی مانند پاتا ہوں، جس کو سمندر میں جا کر گرنے کی ہدایت کی جاتی ہو اور اپنی بے مائیگی کو اور بھی زیادہ محسوس کرتا ہوں، بایں ہمہ میں اپنی اس خوش قسمتی کا ممنون احسان ہوں۔ کہ جو کام میرے سپرد کیا گیا ہے وہ آسان ہونے کے ساتھ ہی انتہا درجہ خوش گوار ہے کہ مجھے آپ صاحبان کا آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اس اٹھائیسویں اجلاس میں راولپنڈی تشریف فرما ہونے پر آپ کا خیر مقدم کرنا ہے اور آپ کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ پس میں نہایت مودبانہ طور پر اور نہایت صدق اور جوش کے ساتھ اپنا اور مسلمانان قسمت راولپنڈی کا دلی خیر مقدم آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔ باقی رہا آپ کا شکریہ ادا کرنے کا سوال۔ اس کی نسبت میں چند الفاظ گزارش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ آپ کی یہ بزرگ تعلیمی مجلس اس سے پیشتر ۲۷ اجلاس ہندوستان کے مختلف مقامات پر کر چکی ہے۔ لیکن ان تمام مقامات میں جیسے کہ دہلی۔ کلکتہ۔ بمبئی اور کراچی وغیرہ میں کچھ تاریخی یا معاشی دل چسپیاں اور دل فریبیاں بھی موجود تھیں اور کہا جا سکتا ہے کہ وہ خاص اسباب بھی ممبران کانفرنس کو ان مقامات کی طرف کشش کرنے کا باعث ہوئے ہوں گے۔ لیکن راولپنڈی کسی ایسے قسم کی دلکش خصوصیت سے خالی ہے۔ اور اگر اس میں کوئی امتیاز ہے تو صرف یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی ایک ایسی کثیر آبادی کا مرکز ہے جہاں جہالت اور بے علمی کی گہری تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ قسمت راولپنڈی کی آبادی کی کیفیت کو ملاحظہ فرمائیے۔ تمام ڈویژن میں ۳۳ لاکھ کی آبادی ہے جن میں سے ۲۹ لاکھ مسلمان ہیں۔ اسی طرح ہماری ہمسایہ قسمت ملتان میں ۳۸ لاکھ میں سے ۳۰ لاکھ مسلمان ہیں۔ گویا برٹش پنجاب کے مسلمانوں کی ایک کروڑ ۱۰ لاکھ کی آبادی میں سے ۶۰ لاکھ مسلمان ان دونوں قسمتوں میں آباد ہیں۔ پھر ہمارے ڈویژن کے ایک جانب صوبہ سرحدی ہے۔ جہاں قریب قریب تمام مسلمان آباد ہیں، اور دوسری جانب ریاست کشمیر ہے جس میں تقریباً ۹۵ فی صدی مسلمانوں کی آبادی ہے۔ لیکن ان علاقہ جات کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت نہایت درد ناک طور پر پست ہے جس کی تفصیلات آپ کو اپنے اجلاس کی کارروائیوں کے دوران میں معلوم ہوں گی، مگر جہاں ہمارا علاقہ اور ہماری ہمسایہ سرزمین میں جیسے کہ میں نے کہا ہے، جہالت اور بے علمی کا امتیاز ہے۔ وہاں آپ کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ اس تمام علاقہ کے مسلمان باشندگان کو قدرت نے جو جسمانی اور دماغی خصوصیات عطا فرمائی ہیں ان کے لحاظ سے بھی وہ ایک خاص حق امتیاز رکھتے ہیں۔ و آپ صاحبان کو معلوم ہو گا۔ کہ

ہماری سلطنت کی افواج قاہرہ میں مسلمان سب سے زیادہ راولپنڈی ڈویژن اور صوبہ سرحدی کے ہیں۔ اور اسی طرح کشمیری دماغوں کے جوہر کسی سے مخفی نہیں ہیں پس جس قدر کہ اس علاقہ کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت ردی ہے اور جس قدر کہ اس تولہ کے مسلمان تعلیم و تربیت سے قوم کے لئے مفید افراد بنائے جا سکتے ہیں۔ اسی قدر آپ صاحبان کا جو اس حصہ ملک کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت پر غور کرنے اور ان کی ترقی تعلیم کی تدابیر سوچنے کے لئے تشریف لائے ہیں، ہمارے شکریہ اور احسانمندی پر زیادہ حق ہے۔ درحقیقت کانفرنس کا یہ اجلاس جو راولپنڈی جیسے ایسے مقام پر منعقد ہوا ہے جہاں سردی زیادہ ہے اور اس کے ایک گوشہ ملک میں واقع ہونے کی وجہ سے سفر کی تکلیف بھی زیادہ برداشت کرنی پڑتی ہے تعلیم یافتہ مسلمانان ہندوستان کی قومی ہمدردی کے امتحان کا ایک موقع ہے اور اس امر کا ثبوت ہم پہنچاتا ہے کہ قوم میں ایسے پاک اور ہمدرد نفوس کس قدر ہیں جو ایک ایسے مقام پر جہاں سیر و تفریح کا کوئی سامان کشش کرنے والا نہیں ہے محض اپنے پس ماندہ بھائیوں کی بھلائی کی خاطر بہت سی تکالیف برداشت کرنے کے لئے تیار ہو کر آئے ہیں۔ خداوند کریم آپ کو اس کی جزائے خیر دے۔

اے صاحبان! آفتاب جب نکلتا ہے تو نہ صرف پہاڑوں اور میدانوں ہی کو روشن کرتا ہے۔ بلکہ غاروں اور خندقوں میں بھی روشنی پہنچاتا ہے، اور اس دفعہ اگر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے آفتاب نے اپنی پوری روشنی ڈالنے اور گرمی کا فیض پہنچانے کے لئے ہماری اس تاریک اور سرد سرزمین کو منتخب کیا ہے تو ہم اس احسان کی وسعت اور عظمت کو بخوبی سمجھتے ہیں اور اس کا کافی شکریہ نہیں ادا کر سکتے۔ جو لوگ کانفرنس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس نے عملی کام کچھ نہیں کیا وہ صرف اتنی بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ بیج ڈالنے سے پہلے زمین کو تیار کرنا ضروری ہے، اور یہی سب سے زیادہ محنت کا اور دشوار کام ہے۔ ہم کو اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ جہاں جہاں قوم کی تعلیم کی کھیتیاں اچھی طرح بار آور ہو رہی ہیں، وہ زمینیں کانفرنس ہی کے تردد سے تیار ہوئی ہیں، اور ہم کو یقین ہے کہ ہماری خوش قسمتی سے اس دفعہ ہماری سرزمین کی باری آئی ہے اور اگر ہماری زمین اچھی ہے، تو خدا کی مہربانی سے آپ دیکھیں گے کہ یہ کھیتیاں کیسا اچھا پھل لائیں گی اور کانفرنس کی یہ مساعی کیسی مشکور ثابت ہونگی۔

ہمارے حکام عالی مقام نے کانفرنس کے اس اجلاس کے متعلق جو دلی ہمدردی اور مہربانی کا اظہار فرمایا ہے اس کا خاص طور پر شکریہ ادا کرنا ہمارے ذمہ لازمی ہے۔ ہم نے عالی جناب ہز آنر نواب لفٹنٹ گورنر

بہادر پنجاب کی خدمت بابرکت میں اجلاسِ کانفرنس میں رونق افروز ہونے کی گزارش کرنے کے لئے عریضہ
پیش کرنے کی جسارت کی تھی جس کے جواب میں جناب ممدوح کے پرائیویٹ سکرٹری صاحب بہادر نے
حسب ذیل نوازش نامہ تحریر فرمایا ہے کہ "میں نے آپ کے عریضہ مورخہ ۱۰ دسمبر کو ہز آنر نواب لفٹنٹ گورنر بہادر
کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ اس کے جواب میں جناب موصوف نے اس امر کی آپ کو اطلاع دینے کی ہدایت
فرمائی ہے کہ ہز آنر آپ کی دعوت کی دل سے قدر فرماتے ہیں اور کانفرنس کی کارروائیوں کو جس کی اغراض
کے ساتھ اُن کو ہر ایک قسم کی پوری ہمدردی ہے، گہری دلچسپی سے ملاحظہ فرماتے رہیں گے۔ لیکن جناب ممدوح
کو افسوس ہے کہ کرسمس کے ہفتہ کی لاہور کی سابقہ طے شدہ مصروفیات کی وجہ سے ہز آنر اجلاسِ کانفرنس
میں شرکت نہیں فرما سکیں گے۔"

جناب کرنل پوپہم ینگ صاحب بہادر سی۔ آئی۔ ای کمشنر راولپنڈی ڈویژن نے صرف اجلاسِ کانفرنس
کو اپنی شمولیت سے زینت بخشنے ہی کا وعدہ نہیں فرمایا، بلکہ کمال مہربانی سے ممبرانِ کانفرنس سے ملاقات
کرنے کے لئے ان کو اپنے دولت خانہ پر گارڈن پارٹی کے لئے مدعو فرمایا ہے۔ جناب مسٹر رینوف صاحب بہادر
ڈپٹی کمشنر اور مسٹر جرنلم صاحب بہادر سپرنٹنڈنٹ پولیس راولپنڈی نے نہایت ہمدردی سے ہر طرح کی
امداد فرمائی ہے، اور ایسے ہی اعلیٰ افسرانِ فوج مثلاً جنرل سر جی گکشن صاحب بہادر کمانڈنگ سیکنڈ راولپنڈی
ڈویژن اور دیگر اصحاب مثلاً کرنل ہیرڈ صاحب بہادر اسسٹنٹ ڈائرکٹر سپلائی و ٹرانسپورٹ و میجر بروننگ
صاحب بہادر کنٹونمنٹ مجسٹریٹ نے بڑی کشادہ دلی سے ہم کو بہت قیمتی مدد دی ہے، اور ان سب اصحاب کا
میں اپنی اور ریسپشن کمیٹی کی جانب سے تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میں ایک بڑی فروگذاشت کے گناہ کا مرتکب ہونگا اگر اس موقع پر میں اپنے ہندو اور سکھ بھائیوں اور
پادری صاحبان اور افسرانِ سررشتہ تعلیم کا شکریہ خاص طور پر ادا کروں۔ ہمارے مہمانوں کے قیام کے لئے
ڈی۔ اے۔ وی ہائی اسکول مشن ہائی اسکول۔ خالصہ ہائی اسکول۔ ڈینیس ہائی اسکول۔ گورنمنٹ ہائی
اسکول اور نارمل اسکول کی عمارتیں استعمال کے لئے ہمارے حوالہ کر دی گئی ہیں اور جس شوق اور محنت سے
ہمارے ہندو عزیز کام کر رہے ہیں، اور کل ریلوے اسٹیشن پر اور شہر میں ہماری کانفرنس کے محترم پریزیڈنٹ
صاحب کے استقبال میں جس جوش اور ہمدردی سے ہمارے ہندو بھائیوں نے حصہ لیا ہے، اس کو ہم کبھی
فراموش نہیں کر سکیں گے۔

مجھ کو اپنے دوست رائے صاحب ڈاکٹر ان دت صاحب کا بھی خاص شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے اپنی خدمات طبی امداد کے لئے بلا معاوضہ ممبران کانفرنس کی نذر کی ہیں۔

مجھ کو اندیشہ ہے کہ میں نے آپ کا بہت سا قیمتی وقت لے لیا ہے۔ پس میں اپنے مسلمان بھائیوں اور ممبرانِ استقبالیہ کمیٹی اور دیگر اصحاب کا شکریہ ادا کرنے کے کام کو آپ کی کمیٹی کے سکرٹری کے ذمے چھوڑتا ہوں، اور آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں، کہ خداوند کریم ورحیم کا نام لے کر آپ اپنے کام کو میری اس دعا کے ساتھ شروع فرمائیں کہ وہ مجیب الدعوات آپ کی ان مساعی حسنہ میں برکت بخشے، اور آپ کی امیدوں سے بڑھکر ان کو کامیاب ثابت کرے۔

ایڈریس ختم کر کے ملک صاحب ممدوح نے مناسب الفاظ میں تحریک کی کہ جناب مولانا حاجی رحیم بخش صاحب پریسیڈنٹ کونسل بہاولپور اجلاس کانفرنس کے صدر منتخب کئے جائیں۔ جناب حاجی شمس الدین صاحب سکرٹری انجمن حمایت اسلام لاہور نے اس تحریک کی تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ۔

"ہمارے محترم بزرگ قوم جناب ملک صاحب نے انتخاب صدر کی جو تجویز پیش کی ہے وہ نہایت"
"مبارک و مستحسن ہے۔ جناب مولانا حاجی رحیم بخش صاحب ایک ایسے مشہور ہمدرد قوم بزرگ ہیں کہ جن کے"
"اوصاف حمیدہ کا تذکرہ آپ صاحبان کے سامنے کرنا تحصیل لاحاصل ہے۔ آپ کی ذات بابرکات"
"مسلمانوں کے لئے مغتنمات میں سے ہے۔ جناب ممدوح کو مسلمانوں کی عام بہبودی کے کاموں کے"
"ساتھ بالعموم اور مسلمانوں کی تعلیم کے ساتھ بالخصوص گہری ہمدردی اور دلچسپی ہے، اور جس علو ہمتی"
"سے ساتھ جناب ممدوح قومی بہبود کے کاموں میں معاونت فرماتے ہیں وہ سب پر روشن ہے۔ ان"
"تمام امور کے لحاظ سے ہمارے لئے موجب فخر ہے کہ ایسے بزرگ قوم اس کانفرنس کے صدر منتخب ہوں۔"
"حاجی صاحب موصوف نے جس قدر مالی مدد اس وقت تک مختلف انسٹی ٹیوشنز کی اپنی ذات خاص"
"سے کی ہے یا اسلامی ریاست سے دلائی ہے وہ ہر طرح سے قابل تحسین ولائق آفرین ہے۔ میں یقین کرتا"
"ہوں کہ آپ صاحبان میری اس امید کے ساتھ شریک ہونگے کہ جناب حاجی صاحب کی توجہ سے"
"آئندہ اس سے بڑھکر قومی کاموں میں امداد ملتی رہیگی۔ چونکہ اب کانفرنس کا کام شروع کرنا ہے"
"اس لئے میں اس دعا کے ساتھ اس تحریک کی تائید کرتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ ممدوح کو عمر دراز عطا"

"فرمائے اور درخواست کرتا ہوں کہ جناب ممدوح کرسی صدارت پر رونق افروز ہوں.... "

جملہ حاضرین نے انتخاب صدر کی تجویز کو نہایت مسرت کے ساتھ قبول کیا اور جناب حاجی صاحب موصوف نے چیرز کی آوازوں میں صدارت کی کرسی کو زینت بخشی۔ اس موقع پر منشی غلام محمد صاحب خادم کشمیری نے دو رباعیاں پڑھیں جس میں سے ایک رباعی ذیل میں درج ہے ۔

آغاز ترے نام پہ ہو اے رحیم بخش | درماندہ اس گروہ پہ فیض عمیم بخش
دنیا میں ہم کو علم کی دولت سے کر نہال | اور عاقبت میں بخشش جنت نعیم بخش

حاضرین رباعی کا لطف حاصل کر ہی رہے تھے کہ واجب الاحترام صاحب صدر انجمن اپنا ایڈریس پڑھنے کے لئے کھڑے ہوئے اور ایڈریس کے زبان انگریزی میں ہونے کی معذرت کرتے ہوئے فرمایا کہ :-

"حضرات! اگرچہ میرے دوست صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اور قاضی سراج الدین احمد"
"صاحب نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ میرا ایڈریس اردو میں ہو۔ اور غالباً اس وجہ سے کہ میں نے یہ"
"ایڈریس انگریزی میں لکھا ہے یہ صاحبان ناراض ہونگے لیکن میں معافی چاہتا ہوں کہ خاص مصلحت سے"
"مجھے ایسا کرنا پڑا۔ ایسی شاندار کانفرنس کے لئے ایڈریس انگریزی میں ہونا ضروری تھا مگر میں آپ"
"صاحبان سے عرض کرونگا کہ بوجہ کم علمی کے جو غلطیاں مجھ سے سرزد ہو جاویں آپ معاف فرمائینگے"
"میں نے انگریزی بڑھاپے میں پڑھی ہے۔ مگر شکر کرتا ہوں کہ بڑھا طوطا بھی نہیں ہوں....."

انگریزی ایڈریس کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے :-

ترجمہ تقریر صدارت ؎

خواتین و حضرات!

ایسے لمحے بھی انسان کی زندگی میں آتے ہیں جبکہ اس کو اس کام یا فرض کی انجام دہی کے متعلق جو اس پر عائد ہوتا ہے اپنی دماغی ناقابلیت کا سب سے زیادہ احساس ہوتا ہے۔ اس وقت میرے اوپر بھی ایسا یا تقریباً ایسا ہی حس غالب ہے۔ اس پنڈال میں جو سرسید احمد جیسے نیک نہاد و عاقل و فرزانہ، نواب محسن الملک جیسے روشن دماغ فصیح و بلیغ، رائٹ آنریبل سید امیر علی جیسے برگزیدہ فرزند ہند و ممتاز مقنن، مولوی نذیر احمد صاحب جیسے جید عالم، نواب عماد الملک جیسے فاضل و اہل الرائے اور ہمارے پنجاب کے

؎ یہ تقریر کتاب ھذا کے صفحات ۱۳۳ تا ۱۶۰ پر موجود ہے۔

اجلاسِ دوم

یوم یک شنبہ بتاریخ ۲۷ دسمبر ۱۹۱۴ء وقت ۲ بجے سہ پہر سے ۵ بجے تک

زیر صدارت عالی جناب خان بہادر حاجی مولوی رحیم بخش صاحب سی۔آئی۔ای

آنریبل مسٹر جسٹس شاہ دین صاحب آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب اور حاجی مولوی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار کے تار آنریری جائنٹ سکرٹری کانفرنس نے جلسہ میں پڑھکر سنائے جن میں عدم شرکت اجلاس کانفرنس پر افسوس اور کانفرنس کے اجلاس کی کامیابی کی دعا کی گئی تھی۔ نیز ہز آنر نواب لفٹننٹ گورنر بہادر پنجاب کے پرائیویٹ سکرٹری کی چٹھی بھی پڑھی جس کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

گورنمنٹ ہاؤس، لاہور

مورخہ ۱۴ دسمبر ۱۹۱۴ء

مہربان من ۔ میں نے آپکی چٹھی مورخہ ۹ ماہ حال حضور لفٹننٹ گورنر بہادر کے ملاحظہ میں پیش کی جس کے جواب میں مجھے ہدایت ہوئی ہے کہ میں آپ کو مطلع کروں کہ ہز آنر ممدوح آپکے دعوت نامہ پر اظہار خوشنودی فرماتے ہیں حضور ممدوح کو کانفرنس کے اغراض و مقاصد کے ساتھ کمال ہمدردی ہے اور اس کی کارروائیوں کو بغایت دلچسپی ملاحظہ فرمائینگے لیکن افسوس ہے کہ تعطیلات کرسمس کے موقع پر چونکہ سابق کی قرار دادہ مصروفیات ہیں اس لئے ممدوح اجلاس کانفرنس میں شریک نہ ہو سکینگے۔

آپکا وفادار

(دستخط) ایس۔ سی۔ بیلی

لفٹننٹ کرنل

پرائیویٹ سکرٹری

اجلاس سوم

یوم یکشنبہ بوقت ۸ بجے شب

زیر صدارت مولوی حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی

آنریری جائنٹ سکرٹری نے بیان کیا کہ اس جلسہ کیلئے مولوی حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی صدر تجویز ہوئے ہیں لیکن وہ ابھی تک تشریف نہیں لائے اور وقت ہو گیا ہے اس لئے میں استدعا کرتا ہوں کہ مولوی بشیرالدین صاحب اس جلسہ کے صدر قرار دیئے جائیں۔ سب نے اس تحریک کی تائید کی اور مولوی صاحب موصوف صدر جلسہ ہوئے۔ اس کے بعد جناب مولوی عبیداللہ صاحب ناظم نظارۃ المعارف دہلی نے تقریباً ایک گھنٹہ تک وعظ فرمایا۔

مولانا موصوف کا وعظ ختم ہونے پر مسٹر شوکت علی صاحب نے مولانا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک جوشیلی تقریر کی اور اثناء تقریر میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا جو آنریری جائنٹ سیکرٹری کانفرنس کی رائے میں کانفرنس کے پلیٹ فارم کے موزون نہ تھے۔ اس لئے آنریری جائنٹ سیکرٹری نے صاحب صدر جلسہ سے درخواست کی کہ مسٹر موصوف کو اس قسم کی تقریر سے روکا جائے اور عرض کیا کہ اگر نہ روکا گیا تو اس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔ اسی عرصہ میں جناب مولوی محمد حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی رئیس بھیکم پور (علی گڑھ) تشریف لے آئے جو لٹریری سیکشن کے اجلاس کی صدارت فرمانے والے تھے۔

مولوی بشیرالدین صاحب صدر جلسہ خان صاحب ممدوح کی تشریف آوری پر کرسی صدارت سے علیحدہ ہو گئے۔ اور اس طرح جو کارروائی اس وقت ہو رہی تھی وہ ختم ہو گئی۔

مولانا ممدوح کے کرسی صدارت پر تشریف فرمانے کے بعد اول مولوی عبدالحق صاحب بی اے سکرٹری انجمن ترقی اردو نے انجمن کی سالانہ رپورٹ پڑھ کر سنائی جو حسب ذیل ہے :-

اجلاس چہارم

منعقدہ تاریخ ۳۰ دسمبر ۱۹۱۲ء دس بجے دن سے ایک بجے دن تک

زیر صدارت عالی جناب خان بہادر مولوی حاجی رحیم بخش صاحب سی-آئی-ای۔

سب سے پہلے حافظ محمد سعید صاحب نے کلام پاک کی ایک سورۃ خوش الحانی کے ساتھ تلاوت کی۔ اسکے بعد صاحب صدر نے تنگیٔ وقت کی وجہ سے یہ قرار دیا کہ رزولیوشن کے محرکین کو دس منٹ اور موئیدین کو ۵ منٹ تقریر کے لئے دیئے جاتے ہیں اور مولوی بشیر الدین صاحب کو پراونشل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس صوبہ متحدہ کی رپورٹ پڑھنے کیلئے آدھ گھنٹہ دیا جائے اور فرمایا کہ "مقررین اپنے موضوع سے تجاوز نہ فرمائیں گے علاوہ ازیں دو باتوں کا خاص طور سے لحاظ رکھا جائیگا۔ اول یہ کہ اگرچہ کانفرنس ایک اسلامی انجمن ہے لیکن یہاں شرعی فتاوٰی کی بحث کا ہرگز موقع و محل نہیں ہے۔ اس قسم کی بحث دوسرے مناسب موقع پر ہونا چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ کانفرنس ایک تعلیمی مجلس ہے اسلئے پالیٹکس اور سیاسیات کے متعلق بھی کچھ نہ کہنا چاہئے اور نہ کوئی ایسی بات ہونا چاہیئے کہ جسکی وجہ سے اختلافات پیدا ہوں کانفرنس اپنے دائرۂ عمل کے اندر نہایت مفید تعلیمی خدمت انجام دے رہی ہے اور جہاں جہاں اسکے اجلاس ہوتے ہیں وہاں کے مسلمانوں میں تعلیمی تحریک کو بہت کچھ تقویت پہونچی ہے۔ اسلئے کانفرنس میں ایسے خیالات کا اظہار نہو جس سے اختلافات پیدا ہوں اور جو صحیح ہمکو پہلے اپنی حالت پر تبادلہ خیالات اور ضروری کارروائیوں کا منشا ہی وہ ہاتھ سے نہ جانا چاہیے جو کام ہمکو آج کے پروگرام کے لحاظ سے درپیش ہیں انکو باحسن وجوہ انجام دینا چاہیئے۔ کوئی صاحب براہ کرم کسی مقررہ کارروائی کے علاوہ کسی جدید امر کے پیش کرنیکی اجازت نہیں دیجاتی۔ جو کام آج کے لئے قرار دیا گیا ہے وہی ہونا چاہیئے پس اب میں مولوی بشیر الدین صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی رپورٹ پڑھکر سنائیں"

چنانچہ مولوی بشیر الدین صاحب بحیثیت سکرٹری پراونشل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس صوبجات ممالک متحدہ اپنی رپورٹ پڑھنے کیلئے اٹھے لیکن قبل اسکے کہ موصوف رپورٹ پڑھنا شروع کریں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے مولوی صاحب موصوف کا حاضرین جلسہ سے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ وہ بزرگ ہیں جنکی تنہا کوشش اور جانفشانی کی بدولت اٹاوہ میں مسلمانوں کی مشہور درسگاہ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ قایم ہوا اور جمیں علاوہ اس صوبہ کے تقریباً تمام صوبوں کے طالبعلم تعلیم پاتے ہیں مولوی صاحب موصوف جس خلوص اور بیحد ایثار سے کام کرتے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے تعلیمی معاملات پر غور کرنے میں اپنی عمر کا بیشتر حصہ صرف کیا ہے اور جو رپورٹ وہ پڑھکر سنائینگے وہ خاص توجہ کے قابل ہوگی۔"

خان بہادر مولوی بشیر الدین

اجلاس پنجم

یوم دوشنبہ بتاریخ ۲۸ دسمبر سنہ ۱۹۱۴ء وقت ۸ بجے شب سے ۱۱ بجے شب تک

کارروائی اجلاس اسکول سیکشن

زیر صدارت جناب خان بہادر صاحبزادہ عبدالقیوم خانصاحب سی ایس آئی

کارروائی اجلاس شروع ہونے سے قبل خواجہ عبدالصمد صاحب ککرو رئیس بارہ مولا کشمیر نے ایک مختصر سی تمہید کے ساتھ حمد و نعت میں ایک نظم (جسکو حاضرین نے دلچسپی سے سنا) پڑھی۔

چونکہ صاحبزادہ عبدالقیوم خاں صاحب جو اسکول سیکشن کے اس اجلاس کی صدارت فرمانیوالے تھے پشاور سے اجلاس شروع ہونیکے وقت تک تشریف نہیں لاسکے اسلیے حسب تحریک صاحبزادہ آفتاب احمد خان جناب خان بہادر مولوی حاجی رحیم بخش صاحب کرسی صدارت پر رونق افروز ہوئے۔ اور مندرجہ ذیل رزولیوشن پاس ہونے سے کارروائی اجلاس شروع ہوئی۔

رزولیوشن نمبر ۱

اس کانفرنس کی رائے ہے کہ ہر قسم کے کارخانہ دار اپنے اپنے کارخانوں میں ایک ایک ٹرننگ کلاس جاری کریں اور اس میں مسلمان نوجوانوں کو عملی تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیں اور جس قدر اور جس حیثیت کا کام امید وار انجام دیسکے موافق انھیں معاوضہ دیں۔ اس میں کارخانہ داروں کا بھی فائدہ ہے اور متلاشی روزگار مسلمانوں کے لیے ایک وسیع اور مفید ذریعہ پیدا ہو جائیگا۔

اصل محرک رزولیوشن کی عدم موجودگی کیوجہ سے جناب غلام حسین خاں صاحب ساکن راولپنڈی نے رزولیوشن کی تحریک کو مختصراً یہ بیان کیا کہ مسلمانوں کے بالعموم صنعت و حرفت کے مفید پیشیکی طرف سے

اجلاس ششم

یوم شنبہ بتاریخ ۲۹ دسمبر ۱۹۱۴ شروع وقت ۱۰ بجے دن سے ایک بجے تک

زیر صدارت عالیجناب خان بہادر حاجی مولوی رحیم بخش صاحب سی آئی ای

چونکہ کارروائی اجلاس کے شروع ہونیکا وقت ہو چکا تھا اور صاحب صدر جلسہ تشریف نہیں لائے تھے اسلئے حسب تحریک صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب جناب مولوی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کرسی صدارت پر رونق افروز ہوئے اور حسب ارشاد جناب صدر جلسہ مولوی انیس احمد صاحب بی اے (علیگ) نے جو بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد مدرسہ عالیہ دیوبند اور نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی میں عرصہ تک قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرتے رہے ہیں "تعلیم القرآن" پر اپنا لیکچر پڑھکر سنایا۔ یہ لیکچر جس جامعیت سے لکھا گیا تھا اور جس پایہ کا تھا وہ خود لیکچر سے واضح ہے تمام حاضرین اس لیکچر کو سنکر نہایت محظوظ ہوئے۔ یہ لیکچر بہ تمام وکمال ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ

گزشتہ کانفرنس منعقدہ آگرہ میں خاکسار نے ایک مضمون پڑھا تھا جس میں زیادہ تر ان دو امور پر بحث کیگئی تھی کہ ہماری قوم کے جدید طبقے میں مذہبی تعلیم کی کس حد تک ضرورت ہے اور اس طبقے کی مذہبی تعلیم کے لئے کس قسم کے معلموں کی ضرورت ہے۔

اس مرتبہ ہماری مذہبی کتاب قرآن مجید کی تعلیم کے متعلق اپنی رائے عرض کرونگا۔ فقط اس قرآن کی تعلیم کا اثر تھا کہ چند سال کے عرصہ میں عرب کے بت پرست جاہل لوگ دنیا میں سب سے زیادہ خدا پرست اور سب سے زیادہ متمدن مہذب دنیا [illegible] تہذیب یافتہ اور سب سے زیادہ طاقتور بن گئے۔

اجلاس ہشتم

یوم سہ شنبہ بتاریخ ۲۹ دسمبر ۱۹۱۴ء وقت ۲½ بجے دن سے ۴½ بجے تک

زیر صدارت عالی جناب خان بہادر مولوی حاجی رحیم بخش صاحب سی۔ آئی۔ ای

صدر انجمن صاحب کے کرسی صدارت پر رونق افروز ہونے کے بعد مولوی الف دین صاحب نے باجازت صاحب موصوف نظم ذیل پڑھکر سنائی جس نے خاص لطف پیدا کیا۔

نظم خطاب بہ مسلم

مسلمانو! کہاں اب ہیں وہ عظمت کے نشاں باقی ۔۔۔ سبق آموز عبرت ہے تمہاری داستاں باقی

نہ وہ محفل، نہ وہ ساماں، نہ وہ میخوارگاں باقی ۔۔۔ نہ وہ مینا، نہ وہ ساغر، نہ وہ پیر مغاں باقی

ہوئی چشم زدن میں بزم اخوان الصفا برہم ۔۔۔ نہ اب وہ شمع ہے روشن، نہ وہ پروانگاں باقی

دل پر داغ ہے اک یادگار محفل رنگیں ۔۔۔ عوض مینا کے رہتی ہے یہ چشم خونچکاں باقی

رہا ہے ہمنشینو! یادگار صحبت عشرت ۔۔۔ خمار بادۂ دوشینہ سے اک سرگراں باقی

ہوئی وہ بزم کیوں برہم، نکمے ہو گئے کیوں ہم ۔۔۔ بپا کیوں ہے یہ ماتم، اور کیوں آہ و فغاں باقی

سبب اس کا تو ہے ظاہر کہ قرآں طاق نسیاں ہے ۔۔۔ پکارے ہے کہ اب میرا نہیں کوئی قدرداں باقی

وہ روح وحدت انساں کہ جس کو لایا تھا نبیؐ ۔۔۔ نہیں اے نام کے مسلم کہیں اس کا نشاں باقی

یہ شیعی ہے وہ ہے سنی یہ رافضی ہے وہ ہے ناصب ۔۔۔ نہیں اے وحدت ملت ترا نام و نشاں باقی

کبھی تھا اتحاد باہمی سرمایۂ نازش ۔۔۔ مگر اب رہ گئیں ہیں لے دے کے خانہ جنگیاں باقی

اترنا ساحل مقصود پر دشوار ہے اپنا ۔۔۔ خلیج شیعی و سنی ہے جب تک درمیاں باقی

بہت ہوں گے خدا حافظ سہارو میرزا پیدا ۔۔۔ رہا گر ادعائے مہدی آخر زماں باقی

ہے جب واحد خدا لئے قبلہ پیغمبر و قرآں ۔۔۔ رہیں پھر کیوں مسلمانو! یہ فرقہ بندیاں باقی

کبھی ہم پیشر درو نے زمین پہ تھے تمدن کے
ہیں اب تک رہگذاروں پر نشانہا کاروان باقی

اگر چین میں ابی کلبشہ ہو تو اندلس میں طارق
ہے ذکر ابن قاسم سندھ میں ورد زبان باقی

زمانے پر عیان ہے رفعت مینار دلی سے
زمین ہند میں اسلام کا ہے آسمان باقی

وہ تاج آگرہ ممتاز عالم اپنی خوبی میں
مجسم ہے سراپا حیرت نظارگان باقی

ادھر چوٹی ہمالہ کی ادھر پرنیر کی وادی
شکوہ سطوت اسلام کے ہیں ترجمان باقی

اشداء علی الکفار تھے رحم دل باہم
تمہاری نرمی و گرمی سے تھا نظم جہان باقی

جب اس نرمی و گرمی پر حکومت تھی فراست کی
تھے اقلیم سیاست میں تمہیں تم حکمران باقی

تھا قرآن ہاتھ میں تکبیر لب پر درد سینے میں
نہ تھا روئے زمین پر کوئی اپنا ہمعنان باقی

جھکا اللہ کے آگے جھکایا ساری دنیا کو
یہ راز عظمت مسلم تھا سجدہ میں نہان باقی

کمال عبدیت میں تھا جلال سلطنت مضمر ـ
یہ نکتہ سیرت احمد سے ہے یکسر عیان باقی

یہودی ہیں کہ نصرانی برہمن ہیں کہ زرتشتی
یہ ہیں سب نعمت اسلام کے تلاشیان باقی

کوئی دن میں یہ سارے جذب ہو جائینگے وحدت میں
رہیگا سکۂ توحید عالم میں روان باقی

تو اے دین الٰہی کا شعب اسرار فطرت ہے ـ
رہیگا تیرے قبضہ میں ہمیشہ ملک جان باقی

گل توحید قرآن سے معطر ہے مشام جان
رہیگی باغ احمد میں بہار بے خزان باقی

الٰہی کیا ہوا وہ اعتصام عروۃ الوثقےٰ ـ
کہ ہے اب منتشر شیرازۂ اسلامیان باقی

نہ وہ مومن نہ وہ ایمان نہ وہ مسلم نہ وہ عرفان
یونہی ہیں پیکر بے جان بدست زندگان باقی

نہ ساجد ہیں نہ ہیں راکع نہ قاعد ہیں نہ ہیں قائم
نہ سرافرازیان باقی نہ سرافرازیان باقی

جمود عام سے طاری نہیں تیزی ناخنوں میں
نہ دل میں نرمیان باقی نہ خوں میں گرمیان باقی

نہ سر سید کی دلسوزی نہ مہدی کی دل افروزی
نذیر خوش بیان باقی نہ شبلی نکتہ دان باقی

ہے گلدستۂ رنگیں سے اک شیریں بیان حالی
سو ہیں یہ اک گل پژمردہ یادگلستان باقی

الٰہی دیر تک محفوظ رکھیو دست گلچیں سے
کہ ان کے بعد یاں خالی ہے جائے رفتگان باقی

گل اشک چشم لالۂ داغ دل سنبل پریشانی
یہی اب رہ گئی ہے یادگار گلستان باقی

مدد اے جذبۂ فیض خدا سے برتر و دانا
کہ ہے اس دور تحبت میں یقین رخصت گمان باقی

نسیم آتش

ترا در چھوڑ کر یا رب بتا جائے کہاں مسلم ۔ کہ ہے اللہ والوں کا یہی اک آستاں باقی
تو اکرم ہے کریموں میں تو ارحم ہے رحیموں میں ۔ تو ہی اک بیکسی میں ہے نصیر بیکساں باقی
شفیق عاجزاں ہے تو غفور عاصیاں ہے تو ۔ تو ہی بس بے بسی میں ہے رفیق بے بساں باقی
سہارا تیری رافت پر بھروسہ تیری رحمت پر ۔ کرم پر ہے ترے تکیہ معین و مستعاں باقی

ترا ارشاد ہے مولیٰ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِی
رہے گا کب تلک محزون نفیسؔ خستہ جاں باقی

خاکسار۔ الف دین نفیسؔ

نظم کے ختم ہونے کے بعد جناب مولوی محمد اکرام خان صاحب ریٹائرڈ جج و پریسیڈنٹ اسلامیہ اسکول پونچھ نے ایک مختصر تقریر فرمائی جو حسب ذیل ہے۔

میرے مکرم دوست پیر حسام الدین شاہ صاحب سجادہ نشین پونچھ نے آیۃ شریف هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ کی تعمیل کی ہے جس کا کرنا ہم پر واجب تھا یعنی اسوقت تک جس قدر رعائتیں یا عطیات ہمیں ملے ہیں اُن کا شکریہ مناسب ہو جو کیا گیا لیکن حضرات اس سے کہیں یہ نہ سمجھ جاویں کہ بس اسی میں ہمارے اغراض و مقاصد پورے ہو گئے ہیں۔ نہیں ہم گز نہیں تمہاری آرزوئیں بہت باقی ہیں تمہاری ضروریات تعلیمی بہت وسیع ہیں۔ انٹرمیڈیٹ ڈیپارٹمنٹ جاری کرنے کے لئے بڑے روپیہ کی ضرورت ہے جس قدر زیادہ روپیہ کی ضرورت ہے اسی قدر ہم باشندگان ریاست پونچھ زیادہ افلاس زدہ ہیں۔ اس لئے میں مؤدبانہ طور پر اس عظیم الشان کانفرنس کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ پونچھ بھی کشمیر سے ملحق ہے یہاں تک کہ خط و کتابت میں بھی پونچھ کشمیر لکھا جاتا ہے پس جہاں کہ کانفرنس میں کشمیری مسلمانان کی اصلاح کا ذکر آوے ہاں بھی پونچھ کو بھی الحاق اور منسلک کرنے کا رتبہ بخشا جاوے تاکہ اکابرین کانفرنس کو علیحدہ تکلیف گوارا نہ کرنی پڑے اور ساتھ ہی میں تحریک کرتا ہوں کہ براہ عنایت کانفرنس سے حضور سری راجہ صاحب بہادر پونچھ اور جناب کپتان سی۔ ایف میکنزی صاحب بہادر اسپیشل اسسٹنٹ رزیڈنٹ اور جناب پنڈت جنار دہن صاحب وزیر ریاست کو خطوط لکھے جاویں اور ساتھ ہی آئندہ مسلمانان پونچھ کی تعلیمی ترقی کے لئے یہی تحریک فرمائی جاوے تاکہ سلسلہ جلدی ہو جاوے۔

چند رزولیوشن کی اہمیت کیوجہ سے پروگرام مطبوعہ مین کسیقدر فرق کیا گیا اور اول دو رزولیوشن پیش ہوئے جو پروگرام کے آخر مین درج تھے چنانچہ وہ رزولیوشن ذیل باتفاق پاس ہوئے

رزولیوشن نمبر (۲۹) مسلمانان کشمیر

ریاست کشمیر کے مسلمانون کی تعلیمی ترقی کے لئے ضروری ہی کہ دہان کے سررشتۂ تعلیم مین مسلمانون کی کافی تعداد ہو اس لئے یہ کانفرنس حضور مہاراجہ صاحب بہادر ریاست کشمیر سے بادب مستدعی ہے کہ جس طرح دیگر اقوام کے طلبہ کو وظیفہ دیکر ٹرننگ کالجون کی تعلیم کے لئے بہیجا جاتا ہے مسلمان طلبہ کو بھی وظیفہ دے کر ٹرننگ کالجون مین داخل کرایا جاوے۔

رزولیوشن نمبر (۳۰)

اس کانفرنس کی رائے مین مسلمانان صوبۂ سرحدی وصوبۂ پنجاب کی تعلیمی ترقی کے لئے ضروری ہی کہ جس طرح ممالک متحدہ کی گورنمنٹ نے اپنے رزولیوشن مجریہ ۲۵ اگست ۱۹۱۲ء کے ذریعہ سے ہر ضلع مین اُس ضلع کے مسلمانون کی تعلیم کی نگرانی کے لئے مسلمان ممبرون کی کمیٹیان افسر ضلع کے زیر صدارت قایم کیجانے کی تحریک کی ہے اس طرح ان ہر دو صوبجات کے اضلاع مین کمیٹیان قایم ہون۔

رزولیوشن نمبر (۳۱)

یہ کانفرنس گورنمنٹ ہند سے بادب التجا کرتی ہے کہ جو روپیہ کثیر ان مسلمانون کے جو منافع سود کے سیونگ بنکون مین جمع ہین جو سود لینا نہین چاہتے وہ اس کانفرنس کو عطا فرمایا جاوے ین اور ان سے یونیورسٹی کے متعلق ایک ہوسٹل مسلمانون کیواسطے قایم کیا جاوے اور جو آمدنی اس ہوسٹل سے ہو وہ مسلمان طلبہ کے وظائف مین صرف کیجاوے۔ رزولیوشن نمبر ۳۲ واپس لیا گیا اور نمبر ۳۳ ملتوی کیا گیا

بعد اس کارروائی کے مولانا شاہ سلیمان اشرف صاحب واعظ مدرسۃ العلوم علیگڑھ نے جو خاص بغرض شرکت کانفرنس تشریف لائے تھے وعظ فرمایا۔

وعظ[1]

جناب مولٰنا سید سلیمان اشرف صاحب

بموقع

اجلاس بست و ہشتم آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

خطبۂ مسنونہ و صلوٰۃ سنجنا، تعوذ و تسمیہ کے بعد یہ آیت کریمہ تلاوت کی گئی۔ ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ؕ

بشارت فتح مبین

یہ آیہ کریمہ آخر رکوع سورۂ فتح کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کی ایک جماعت ہے جو حبیب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمرکابی میں سعادت کونین کی دولت لوٹتی ہوئی مدینہ طیبہ واپس جا رہی ہے۔ بغرض عمرہ رسول کریم علیہ الوف الصلوٰۃ والتسلیم چودہ سو مسلمانوں کو لیکر عازم مکہ معظمہ ہوئے تھے۔ کفار مزاحم ہوئے اور حدیبیہ سے آگے بڑھنا نہ ہوا۔ گو یہ واقعہ طویل ہے۔ مختصراً یوں سمجھیے کہ ایک صلح نامہ لکھا گیا جس کے شرائط مسلمانوں پر شاق تھے۔ لیکن سرکار دو عالم کی بہتری اسی میں تھی لہٰذا بسر و چشم منظور تھا۔ مگر اس طرح کی مراجعت نے دلوں کو اس کیفیت کو جس میں ایک سوزش اُس سوزش میں اخلاص اُس اخلاص میں عبودیت کاملہ موجود تھی ذرا چمکا دیا تھا۔ اس پر منافقین کے استہزا و طعن و تشنیع اور بھی نمک چھڑکتے جاتے تھے۔ پس کمال نیازمندی، انتہائے تذلل و انکسار سے قلوب مؤمنین

[1] یہ "وعظ" آپ کتاب ھٰذا کے صفحات ۱۸۱ تا ۱۴۴ پر ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

اجلاس ہشتم

منعقدہ

یوم سہ شنبہ بتاریخ ۲۹ دسمبر ۱۹۱۴ء بوقت شب ۸ بجے سے دس بجے تک

زیر صدارت عالی جناب خان بہادر مولوی رحیم بخش صاحب سی - آئی - ای

سب سے پہلے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے رزولیوشن نمبر ۳۵ کی تحریک کی اور کہا کہ میں مندرجہ ذیل حضرات کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان صاحبان نے قومی تعلیم میں دلچسپی کا اظہار فرمایا ہے اور ہمارا فرض ہے کہ علی الاعلان اس کا اعتراف کریں۔ تمام حاضرین نے اس سے اتفاق کیا اور اصحاب ذیل کا شکریہ منظور ہوا۔

رزولیوشن نمبر ۳۵

یہ کانفرنس مندرجہ ذیل اصحاب کا ان کی بیش بہا تعلیمی خدمات کے واسطے شکریہ ادا کرتی ہے۔

صوبہ سرحدی کشمیر و پنجاب

شاہپور نواب کپتان ملک محمد مبارز خان صاحب - ٹوانہ رئیس اعظم۔
گجرات - خان صاحب چودھری فضل علی خان صاحب رئیس و آنریری مجسٹریٹ۔
مفتی محمد دین صاحب پلیڈر سکرٹری لوکل کمیٹی۔
جہلم - مولوی محمد اکرم صاحب بیرسٹر ایٹ لا۔ سکرٹری انجمن مدد تعلیم جہلم
راولپنڈی - قاضی سراج الدین احمد صاحب بیرسٹر ایٹ لا۔

پنڈت جواہر لال نہرو مدح سرسید میں

تحریک کی تاریخ کی ورق گردانی سے یہ بھی محسوس ہوا کہ سرسید اور ان کے رفقاء پر بسا اوقات ان کی برطانوی حکومت سے وفاداری اور تحریک آزادی سے علاحدگی کے باعث تنقید کی جاتی ہے۔ اس تنقید کے محرکات یا تو سیاسی اور بعض دوسرے رجحانات ہیں یا اس کی وجہ تاریخی حقائق تک ناکافی رسائی ہوتی ہے۔ یہ اپنی جگہ سچ ہے کہ کانفرنس کے قائدین نے شروع میں حکومت سے تعاون پر زور دیا کیوں کہ ان حالات میں یہ ناگزیر تھا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ مسلمانوں کو ہر قیمت پر ایک پس ماندہ اور غیر موثر اقلیت میں تبدیل ہو جانے سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں ایک جگہ سرسید اور ان کی تحریک پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"سرسید نے اپنی پوری قوت جدید تعلیم کی طرف مرکوز کر دی تھی اور اپنی قوم کو کسی دوسری طرف متوجہ ہونے دینا نہیں چاہتے تھے کیوں کہ یہ ایک دشوار کام تھا اور مسلمانوں کی ہچکچاہٹ دور کرنا مشکل تھا۔ سرسید کا فیصلہ کہ مسلمانوں کی ساری توجہ مغربی تعلیم حاصل کرنے پر صرف کر دی جائے بلاشبہ درست تھا۔ اس کے بغیر وہ جدید ہندوستان کی تعمیر میں کوئی موثر رول ادا نہیں کر سکتے تھے۔"

(آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سوسال مرتبہ امان اللہ خاں شیروانی، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۹۴ء، صفحہ ۱۴)

پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ کی دیگر کتب

ادارہ پاکستان شناسی لاہور